از رجب ۱۳۸۸ھ تا جمادی الثانی ۱۳۸۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۶۸ء تا ستمبر ۱۹۶۹ء

مجلۃ علمیۃ و دینیۃ

کی

چوتھی جلد

مرتبہ

سمیع الحق استاد دار العلوم حقانیہ

شائع کردہ

دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور

مغربی پاکستان

اس ضمیمہ میں الحق کے سال چہارم کے تمام مضمون نگار حضرات کے اسمائے گرامی اور مضامین کی فہرست حروف تہجی کی ترتیب سے دی گئی ہے۔ جو حضرات الحق کا فائل رکھنا چاہیں جیسا کہ ارباب ذوق اور علمی قدردانوں سے امید ہے، وہ اس فہرست کو اپنی جلد کے آغاز میں لگوالیں۔

جلد نمبر: ۴ — جمادی الثانی ۱۳۸۹ھ
شمارہ نمبر: ۱۲ — ستمبر ۱۹۶۹ء

بدل اشتراک

مغربی پاکستان سالانہ چھ روپے فی پرچہ ۶۰ پیسے
مشرقی پاکستان سالانہ بذریعہ ہوائی ڈاک آٹھ روپے، فی پرچہ ۷۵ پیسے
غیر ممالک سالانہ ایک پونڈ۔

سمیع الحق استاذ دارالعلوم حقانیہ طابع و ناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا۔

نقشِ آغاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علماء کرام کے باہمی مذاکرات اور مفاہمت کے سلسلہ میں ۱۶ اگست کو حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہٗ اچانک کراچی تشریف لے گئے ۳ ستمبر کو واپسی ہوئی۔ واپسی پر آپ نے اس سلسلہ میں جو تاثرات تحریر فرمائے ہیں اسے بامید غور و خوض دونوں طرف کے اکابر اہل علم کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ —— ادارہ ——

چند دنوں سے اخبارات اور رسائل میں علماء دیوبند کے درمیان اختلافات کا چرچا ہے۔ لادینی عناصر اس اختلاف کو اغراض مشئومہ کی خاطر اچھال رہے ہیں۔ علماء حق کے درمیان اختلاف کی خلیج وسیع ہونے کی صورت میں دین اور دینی مقاصد کو جس شدید نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے اس سے ہر حساس مسلمان کو پریشانی ہوگی۔ خود دونوں طرف کے اکابر علماء کو اس صورتحال کے پیدا ہو جانے سے شدید تشویش ہے —— مگر صورتحال بگڑتی جارہی تھی، اس ناچیز کو بھی کافی دنوں سے ان حالات نے سخت اضطراب اور بے چینی میں ڈال دیا تھا۔ کہ باطل سے ہر محاذ پر ڈٹ کر لڑنے والے اور کلمۂ حق کہنے والے علماء دیوبند ہی تو ہیں، اگر ان کی تمام صلاحیت اور اجتماعی و تنظیمی قوتیں ایک دوسرے سے تصادم میں مشغول ہو جائیں تو باطل نظریات رکھنے والے اصحاب اور جماعتوں کو یکسوئی سے اپنی فاسد اغراض کو پورا کرنے کا موقعہ مل جائے گا۔ اور لادینی عناصر اپنے خبیث مقاصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ علماء حق کے اختلاف ہی میں انہیں اپنی کامیابی نظر آتی ہے چنانچہ درپردہ ان عناصر ہی کی ریشہ دوانیوں سے اختلاف کی یہ صورت شدت اختیار کرنے لگی ہے۔

حسنِ اتفاق سے علماء کی ایک نئی تنظیم کے سلسلہ میں ان دنوں کراچی میں مشرقی پاکستان کے چند سرکردہ علماء جمع ہوئے تھے جنہیں اس صورتحال کا احساس تھا۔ مولانا اطہر علی صاحب مشرقی پاکستان اور ان کے رفقاء کے بار بار اصرار اور تقاضا اور اکابر کے مشورہ پر یہ ناچیز بھی کراچی حاضر ہوا تاکہ دونوں طرف کے اکابر علماء کو باہم بیٹھ کر ایک دوسرے کا نقطۂ نظر سمجھنے اور پھر مفاہمت کی کوئی صورت نکالنے کا موقعہ مل جائے۔

کراچی کے ان مذاکرات میں ملک کے دونوں حصوں سے دونوں طرف کے اکابر علماء نے شرکت کی ناچیز کے علاوہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا محمد یوسف بنوری، حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی، حضرت مولانا اطہر علی صاحب (کشور گنج) مولانا مفتی دین محمد صاحب ڈھاکہ۔

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب، حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی، حضرت مولانا محی الدین صاحب ایڈیٹر مدینہ ڈھاکہ۔ وغیرہ نے شرکت کی۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے کے خیالات سے یہ چیز واضح ہو کر سامنے آگئی کہ اصل مقصد سب کا اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام کا نفاذ ہے۔ مگر طریق کار اور سیاسی موقف میں کچھ اختلاف ہے، گویا درحقیقت اس نزاع کی حقیقت نزاع لفظی کے سوا کچھ نہیں بشرطیکہ فریقین ایک دوسرے کو مخلص سمجھ کر ٹھنڈے دل سے ایک دوسرے کے خدشات اور شبہات کو سمجھنے اور اس کے رفع کرنے کی کوشش کریں۔

سوشلزم، اشتراکیت اور کمیونزم کے خلاف اسلام ہونے پر سب متفق ہیں کوئی ایک بزرگ بھی ایسا نہیں جو اسے تاویل وغیرہ کے ذریعہ یا کسی حکمت و مصلحت کی وجہ سے برداشت کرنے یا اس سے مصالحت کرنے کا روادار ہو، کوئی بھی اس ملک میں کسی بھی "ازم" کا تسلط نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے اس ملک میں نظریہ پاکستان، نظام شریعت اور اسلامی آئین کے مکمل تنفید کے علاوہ کوئی اور ازم نافذ ہو، خواہ اقتصادیات یا معاشیات ہی میں کیوں نہ ہو۔ کوئی بھی عالم کسی بھی ازم کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح مزدور اور کسانوں کے حقوق، محتاجوں اور مساکین کو بنیادی ضروریات مہیا کرنے سے بھی کسی کو اختلاف نہیں۔ اسلام میں جسقدر حقوق مزدور کسان، آجر و مستاجر کیلئے ہیں ان کی ادائیگی پر سب متفق ہیں، اور سب مانتے ہیں کہ اسلام نے جس جامع اور مکمل طریق سے ہر طبقہ کے مسائل کو حل فرمایا ہے اور مختلف پیرایوں میں ترغیب و ترہیب کے ذریعہ اسکی ادائیگی کی تلقین کی ہے، کوئی بھی ازم اس کا عشر عشیر بھی نہیں کر سکتا۔ ان ازموں میں فریب اور دھوکہ کے سوا کچھ بھی نہیں، تمام انسانی صلاحیتیں اور کسب و تصرف کے نتائج و ثمرات ایک بڑے سرمایہ دار میں، جو بشکل حکومت اور پارٹی انسانوں پر مسلط رہتا ہے میں مرتکز ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ ازم ملک اور قوم غریب و امیر لیبر یا صنعتکار سب کے حقوق چھین کر انہیں ایک جابر و سنگدل ڈکٹیرانہ نظام کے شکنجہ میں دیدیتے ہیں۔ دوسری طرف اسلام ہے جس نے حلال اور جائز ذرائع و وسائل کے اندر رہ کر اپنی قوت اور صلاحیت کے ذریعہ حصول دولت کے راستے بھی کھلے رکھے۔ اور اجیر و مستاجر، مزدور اور کسان سب کے حقوق بھی متعین کر دئیے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری وصیت فرمائی: الصلٰوۃ وما ملکت ایمانکم۔ نماز قائم رکھو اور اپنے زیر دست لوگوں سے حسن سلوک اور احسان کیا کرو۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

ھؤلاء اخوانکم جعلھم اللہ	یہ مملوک تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں
تحت ایدیکم فمن کان لہ	تمہارے قبضہ میں دیدیا ہے۔ پس جس کے تصرف
اخوہ تحت یدہٖ فلیطعمہ	میں کوئی بھائی ہو تو اسے وہی کھلائے جو خود
مما یطعم ولیلبسہ مما یلبس	کھائے اور وہی پہنائے جو خود پہنتا ہو۔

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ مزدور کو اسکی اُجرت اُسکا پسینہ خشک ہونے سے قبل ادا کر دیا کرو مزدور اور مملوک پر اس کی طاقت اور ہمت سے زیادہ بوجھ مت ڈالو اور اگر کام زیادہ سپرد کیا تو خود بھی اسکا ہاتھ بٹھاؤ، تاکہ سارا بوجھ اس پر نہ پڑے حضورؐ کا ارشاد ہے تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو رعایا اور زیردستوں سے حسن سلوک کا برتاؤ کرتا ہے۔ اس قسم کی ہزاروں ہدایات کی موجودگی میں لیبر کے حقوق سے کون انکار کر سکتا ہے۔

بہر تقدیر علماء اس پر متفق ہیں کہ محتاجوں، لیبر اور کسانوں کا کوئی حق بھی غصب نہ ہونے پائے اور جو بھی اسلامی حقوق ہیں ان کو دلائے جائیں اور یورپ کا مروّجہ ظالمانہ مستبدانہ سرمایہ داری نظام معاشرہ سے ختم کر دیا جائے۔ البتہ طریقِ کار کا فرق ہے، ایک فریق کی رائے ہے کہ موجودہ لیبر اور کسان تنظیموں کیساتھ تعاون کیا جائے، اور انہیں اپنے اثر میں لے لیا جائے، ورنہ خطرہ ہے کہ یہ لوگ لادینیت کے علمبردار عناصر اور نااہل لوگوں کے پُرفریب نعروں میں آکر اشتراکیت اور سوشلزم کے قعرِ مذلت میں جا گریں گے جہاں سے ان کا نکلنا مشکل ہو گا۔ اور یہ صورت ملک اور مذہب کی تباہی اور بربادی کا ذریعہ بن جائے گی۔ اور اس کا ظہور لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت کی شکل میں ظاہر ہو گا۔ ولا فعل اللہ کذلک۔

دوسرا فریق کہتا ہے کہ کسی لیبر تنظیم سے تعاون کی بجائے اسلام کا معاشی نظام سامنے رکھا جائے اور ان کو اپنی اسلامی تنظیموں میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ یعنی بجائے لیبر اصول اور تنظیموں کے خالص اسلامی تنظیم کے ماتحت شریعت کے دیئے ہوئے حقوق کے حصول اور تحفظ میں لگ جائیں۔ شریعت کے مکمل نفاذ کے لئے جدوجہد کی جائے تاکہ یہ ملک امن و امان اور اسلامی عدل و انصاف سے مستفید ہو اور خلافتِ راشدہ کے نقشِ قدم پر چلنے کی فضا پیدا ہو سکے۔ الغرض لیبر اور مزدور کے حقوق کا کسی کو انکار نہیں۔ مگر اسی کے حصول کے طریق کار میں اختلاف ہے جو ایک فکری اختلاف ہے جس میں اجتہادی طور پر یا سیاسی بصیرت، اور تجربہ

کے لحاظ سے کسی ایک فریق کو ٹوکر تو ہو سکتی ہے مگر نفس مسئلہ میں کوئی جھگڑا نہیں۔

اب رہا سرمایہ داری کا مسئلہ تو اس بارہ میں مکمل اتفاق ہے کہ جو سرمایہ ظلم و تعدی، سود، سمگلنگ، بلیک، ملاوٹ، احتکار و اکتناز اور جبر و قہر یا دوسرے ان ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو جو یورپ میں رائج ہیں، سب حرام ناجائز اور قابل گرفت ہے، مگر ایک مطلب سرمایہ داری کی مخالفت کرنے کا یہ ہے کہ کوئی بھی شخص کسی حلال اور جائز ذرائع سے پیدا کردہ دولت کا بھی مالک نہ ہو بلکہ حکومت یا کوئی تنظیم ہر چیز کی مالک ہو تو کوئی بھی عالم دین اسے صحیح نہیں کہہ سکے گا۔ اگر شخصی ملکیت کی نفی ہو جائے تو پھر اسلام کے وہ تمام قوانین اور احکام شرعیہ معطل ہو کر رہ جائیں گے، جو زکوٰۃ صدقات، حج، صدقہ، فطر، وصیت، ہبہ اور میراث وغیرہ سے متعلق ہیں۔۔۔ جب کوئی شخص مال کا مالک نہیں تو وہ کب اس قسم کے تصرفات کر سکتا ہے۔؟ الغرض ملکیت ختم کرنے کی یہ صورت تو کسی بھی لحاظ سے اسلام کی رُو سے قابل برداشت نہیں، البتہ سرمایہ داری کی اُن مذموم شکلوں کا شریعت سختی سے محاسبہ کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ کے حقوق تلف ہوتے ہوں، اور خدا اور اس کے بندوں کے حقوق سے اس مال اور دولت میں غفلت برتی جاتی ہو۔ اسلام کے نزدیک سرمایہ داری کی دو قسم ہیں۔ ایک مذموم اور ایک جائز جیسا کہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ جس مال سے زکوٰۃ نہ دی جائے چاہے وہ دو سو درہم کیوں نہ ہو وہ کنز ہے جس کی اللہ نے مذمت کی ہے۔ اور آیت: والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ۔ کی ضمن میں دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے۔ اور جس مال کی زکوٰۃ دی جائے اور اس کے علاوہ اس کے تمام حقوق منتشرہ ادا کئے جائیں، مثال کے طور پر اس میں رشتہ دار و اقارب غریب اور محتاج، پڑوسی اور مسافر مریض اور بے روزگار کی ضروریات کا لحاظ کیا جائے ایسا سرمایہ محمود اور ذریعہ سرخروئی دارین و رضائے خداوندی ہے۔ حلال ذرائع سے پیدا کردہ ایسا مال کتنا ہی کیوں نہ ہو وہ کنز نہیں اور نہ ایسا سرمایہ قابل مذمت ہے۔ باقی رہا ایسی حلال اور جائز سرمایہ داری کے لئے فضا مہیا کرنا اور ناجائز استحصال اور حرام ذرائع سے کسب زر سے روکنا، تو اس کا مکمل علاج تو اسلامی نظام کے نفاذ میں ہے۔ اسلامی حکومت ہر ناجائز ذریعہ غصب ظلم اور چوری ڈکیتی سے حاصل شدہ مال چھین کر اصل حقداروں کو دے سکتی ہے۔ البتہ جائز اور حلال ذرائع سے حاصل شدہ مال کا مالک اس کا مالک ہی رہے گا۔ الغرض سرمایہ داری کی جائز شکل سے کسی عالم کو انکار نہیں، اور ہر عالم کو یورپ کے مروجہ اس سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت ہے جس کے مہلک اثرات سے پوری دنیا کراہ رہی ہے۔ جب اس مسئلہ میں بھی اختلاف نہیں، مقصد سب کا احیاء دین اور اجراء شریعت

ہے۔ صرف طریقِ کار کا فرق ہے، تو ہو سکتا ہے کہ ارشادِ نبویؐ اختلاف امتی رحمۃ ۔ کی رو سے اخلاص پر مبنی اختلاف امت کیلئے موجب خیر بن جائے۔ اس صورت میں اس اختلاف اور نزاع کو اتنا اچھالنا قطعاً نامناسب ہے۔ ایک دوسرے کی پگڑیاں اچھالنے سے مجموعی حیثیت سے تمام علماء کے وقار عظمت اور اس سے بڑھ کر خود اسلام کو شدید نقصان پہنچے گا، جن باطل فرقوں اور لادینی عناصر سے ہمیں خطرہ ہے وہ اس اختلاف سے فائدہ اٹھا کر بیچ میں سے بچ کر نکل جائیں گے۔ ایسے نازک ترین دور میں جب ملک و ملت کو اندرونی اور بیرونی غیر دینی تحریکات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، ہمارا باہمی اختلاف اور ایک دوسرے پر الزام اور جواب الزام میں وقت ضائع کرنا مجموعی حیثیت سے دین کیلئے سخت مضر ثابت ہوگا، جسکے نتیجہ میں خداوند کریم کے ہاں شدید محاسبہ کا سامنا کرنا پڑیگا۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنے قلوب کو ایک دوسرے کے بارہ میں صاف کر کے پورے اخلاص للہیت اور حزم و احتیاط سے کام لیتے ہوئے دین کیلئے کام کرتے رہیں۔ خواہ طریق کار میں اختلاف ہی کیوں نہ ہو، اول تا آخر اسلام ہی کو تمام جدوجہد اور قربانیوں کا مقصود بنائے رکھیں۔ مجھے انتہائی خوشی ہے کہ اکابر علماء نے کراچی کے مذاکرات میں اس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ " فریقین میں سے ہر ایک اپنے اپنے کام کو جاری رکھتے ہوئے کسی دوسرے پر تقریروں میں یا اخباری بیانات میں حملہ نہیں کرے گا، اور ہر فریق دوسرے کا احترام باقی رکھے گا۔" اس مقصد کیلئے ایک رابطہ کمیٹی بھی قائم کی گئی ہے جو مفاہمت اور مصالحت کے مذاکرات جاری رکھے گی۔ حق تعالیٰ اس کمیٹی کی رہنمائی فرمائے اور کلی اتحاد اور مفاہمت کی کوئی صورت اپنی خاص دستگیری سے ظاہر فرما دے، اور ہم سب کو کلمہ اسلام پر شیر و شکر ہو کر جمع ہونے اور کام کرنے کی توفیق دے۔ کیونکہ سرچشمۂ فیض اور منبع علم سب کا ایک ہے، مسلک و مشرب میں اتحاد ہے۔ مقصد سب کا ایک ہے، اتحاد کی ضرورت کا سب کو احساس ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ فریقین ایثار و اخلاص سے کام لیکر ایک نقطہ پر جمع نہ ہو سکیں۔ دونوں طرف سے البتہ تمام حضرات اور جماعتوں کے کارکنوں سے بھی مودبانہ التماس ہے کہ اپنے اکابر کے اس معاہدہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی قسم کی ایسی بیان بازی سے قطعی احتراز برتیں جس سے فریقین کی عظمت اور احترام کو نقصان پہنچتا ہو اور عوام میں شعائر اسلام اور اہل علم کی تضحیک اور استخفاف کی صورت پیدا ہو سکتی ہو۔ اسیطرح اپنی نالائقی اور بے مائگی کے پورے احساس کیساتھ دونوں طرف کے اکابر سے بھی عاجزانہ درخواست ہے کہ وہ ایسی تمام صورتوں سے دین کے مفاد کی خاطر قطعی طور پر الگ ہو جانیکی کوشش کریں، جو فریقین کیلئے ایک دوسرے سے اتحاد اور مصالحت کی راہ میں رکاوٹ اور بدظنی اور خدشات کا موجب بن سکتی ہیں۔ میری یہ گذارشات محض دینی درد اور اکابر اہل علم کے مشفقانہ برتاؤ اور ناچیز سے حسن ظن رکھنے پر مبنی ہیں کسی بھی ذاتی رجحانات کا اس میں قطعی دخل نہیں، امید ہے اسے جذبۂ خیرخواہی پر محمول کیا جائے گا۔

بندہ عبدالحق عفی عنہ مہتمم دارالعلوم حقانیہ ۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۶۹ء

اکابر علماء کا مشترکہ بیان

یکم ستمبر کو کراچی میں باہمی مفاہمت کے سلسلہ میں حسب ذیل علماء کرام کے درمیان ایک بند کمرے میں مذاکرات ہوئے جو کئی گھنٹے تک جاری رہے۔ ان مذاکرات کے بعد حسب ذیل مشترکہ بیان جاری کیا گیا۔ جو شریک اشاعت ہے۔ ـــــ ادارہ ـــــ

کچھ روز کے بعض اخباری بیانات اور اسلام دشمن عناصر کی ریشہ دوانیوں سے جمعیت علماء اسلام کے رہنماؤں کے مابین جو اختلافات اور کشیدگی پیدا ہو گئی ہے اس کو دور کرنے اور باہم ایک دوسرے سے قریب کرنے کیلئے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مولانا محمد یوسف بنوری صاحب، مولانا اطہر علی صاحب، مولانا عبدالحق حقانی صاحب اور مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی پر مشتمل ایک کمیٹی مفتی محمود صاحب، اور مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب کی منظوری سے قائم کی گئی ہے۔ یہ کمیٹی مفاہمت اور مصالحت کے مذاکرات جاری رکھے گی۔

سر دست اس کمیٹی کے ارکان اور مفتی محمود صاحب و مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب نے بالاتفاق اعلان کیا ہے کہ مفاہمت کی گفتگو جاری رہے۔ فریقین میں سے ہر ایک اپنے اپنے کام کو جاری رکھتے ہوئے کسی دوسرے پر تقریروں یا اخباری بیانات میں حملے نہ کریں اور ہر فریق دوسرے کا احترام باقی رکھے۔

۱۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ۲۔ مولانا محمد یوسف بنوری صاحب

۳۔ مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی ۴۔ مفتی محمود صاحب

۵۔ مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب ۶۔ مولانا عبدالحق صاحب حقانی اکوڑہ خٹک

۷۔ مولانا اطہر علی صاحب کشور گنج مشرقی پاکستان

سخنہائے گفتنی

بحمداللہ عزوجل کہ آپ کے اس دینی ترجمان الحق نے اپنی زندگی کے چار سال پورے کر لئے اور اگلے شمارہ سے یہ کاروانِ حق اپنے سفر کی پانچویں منزل پر جادہ پیما ہوگا انشاء اللہ۔ اگر خداوند کریم کی بے پناہ رحمت دستگیری نہ کرتی تو ہم جیسے بے مایہ اور بے بضاعت افراد کیلئے حالات اور ماحول کے تند و تیز طوفان میں اس شمعِ حق کو فروزاں رکھنا ناممکن تھا۔ قارئین کی والہانہ محبت سے حوصلہ افزائی کی اکابر علم و فضل کی نیم شبانہ دعاؤں نے ہماری ڈھارس بندھی، اپنی تہی دامنی اور نالائقی کو دیکھ کر یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک سنگلاخ وادی اور ناساز گار ماحول سے نکلا ہوا یہ پرچہ اتنی پذیرائی پا سکے گا۔ اور دین و تحفظ دین کے سلسلہ میں یہ حقیر کوشش بارگاہ ایزدی میں شرف قبول پا سکے گی، مگر حق تعالیٰ کی کریم نوازیوں پر قربان جائیے کہ اس ضعیف اور ناتواں آواز کو توقع سے بڑھ کر بار آور بنا دیا۔ اور دین کے میدان میں اس کے انقلاب آفریں حد تک اثرات ظاہر ہوئے یہ محض اسی کی شان کریمی کے کرشمے ہیں، کہ تار عنکبوت کو بھی حبل متین بنا سکتا ہے۔

الحق کے اجراء اور اشاعت کا مقصد کوئی مادی اور کاروباری منفعت نہیں، یہی وجہ ہے کہ اسکے مصارف کا زیادہ تر حصہ دارالعلوم کا ناتواں اور متوکلانہ بجٹ برداشت کرتا چلا آرہا ہے۔ اول دن سے ہم اسے عام کاغذ سے سہ گنا مہنگے کاغذ، عمدہ طباعت و کتابت سے صرف چند روپے سالانہ میں پیش کر رہے ہیں، جبکہ اس معیار کے علمی و دینی مجلات کا زرِ اشتراک ۱۲/ روپے سے کم نہیں، اسوقت حالات کا دینی اور سیاسی تقاضا ہے کہ ہم اس آواز کو زیادہ مؤثر اور وقیع بنا دیں، اسے زیادہ رعنائی اور زیبائی کیساتھ پیش کریں، مگر ہماری پشت پر نہ وسائل ہیں نہ ذرائع نہ اشتہارات ہیں، نہ کاروباری ادارے یا کوئی معقول سرمایہ، اور نہ مزید دارالعلوم اس کے خطیر اخراجات کا متحمل ہو سکتا ہے۔ بنا بریں کافی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اگلے ماہ سے اس کا سالانہ چندہ ۸/ روپے کر دیا جائے۔ ہمیں اپنے قارئین کے دینی جذبات و والہانہ تعلق اور جذبہ اشاعت دین سے توقع ہے کہ وہ نہ صرف اس معمولی اضافہ کو بخوشی قبول فرما دیں گے بلکہ اپنے حلقہ میں الحق کی توسیع اس کے استحکام و ترقی اور اس کے لئے مالی وسائل مہیا کرنے میں بھی پوری گرمجوشی دکھائیں گے تاکہ ہم ان کے محبوب رسالہ کو دلی سے اعلیٰ معیار تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکیں۔

— ایڈیٹر

حضرت علامہ شمس الحق صاحب افغانی مدظلہ
صدر شعبۂ تفسیر جامعہ اسلامیہ۔ بہاول پور

سائنس اور اسلام

سائنس فلسفہ اور مذہب کا دائرہ کار

سائنس فلسفہ اور مذہب قدرت کی مادی کائنات میں جو قواعد و ضوابط کارفرما ہیں، جدید دور میں انکی دریافت کا نام سائنس ہے۔ سائنس لاطینی لفظ ہے جسکا معنی ہے جاننا یعنی علم اور جو قوانین مادہ سے ماورا الورا سے متعلق ہیں ان کا نام فلسفہ ہے۔ قدیم یونانی فلاسفہ اول کو حکمت طبعی یا طبعیات سے تعبیر کرتے تھے۔ اور دوم کو حکمت الٰہیات یا حکمت اعلےٰ کے نام سے نامزد کرتے تھے اور ان دونوں اور ان کے علاوہ ریاضی کے تمام اقسام اور اخلاقی، منزلی، اور سیاسی مدنی قوانین سب کو فلسفہ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

دور جدید میں سائنس کے ذرائع علم عصر حاضر میں محسوسات میں فیصلہ کن قوت تجربہ اور استقراء ہے تجربہ اور استقراء اگر تام اور وسیع ہو تو اس کا فیصلہ صحیح ہوتا ہے۔ اور اگر ناقص ہو تو فیصلہ میں غلطی کا امکان ہے۔ مثلاً ۱: قدیم تجربات فلاسفہ یونان اور حکماء یورپ کے یہ تھے، کہ زمین ساکن ہے اور جدید تجربات نے یہ ثابت کر دیا کہ زمین گردش کرتی ہے۔ جس سے پہلے تجربات غلط ثابت ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سابق تجربات ناقص تھے۔ اس کے علاوہ کبھی موجودہ تجربہ کے خلاف مستقبل میں نیا تجربہ ظہور میں آجاتا ہے جس سے پہلے تجربہ کا حکم باطل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ۲: کسی وقت یہ تجربہ تھا کہ تصاویر سینما غیر متحرک ہیں، لیکن اس کے بعد سینما میں تصاویر کے متحرک ہونیکا نیا تجربہ مشاہدے میں آیا جس سے پہلے تجربہ کا حکم غلط ثابت ہوا، اسی طرح پہلے وقت میں سینما کی تصاویر متحرک تھیں مگر ناطق نہ تھیں یعنی بولتی نہیں تھیں۔ اس وقت تجربہ تھا کہ تصاویر سینما اگرچہ متحرک ہیں، لیکن ناطق اور بولنے والی نہیں لیکن اس کے بعد کے تجربہ نے ان تصاویر کا ناطق

ہونا بھی ثابت کیا جس سے پہلا حکم باقی نہیں رہا۔ پھر مادی سائنس کے فیصلے جس احساس پر مبنی معلوم ہوتے ہیں، اور ان کو قطعی اور غیر مشکوک سمجھا جاتا ہے، وہ سو فیصدی حسی نہیں۔ محسوسات اگرچہ خارج میں موجود ہیں، لیکن ہمارے اندر وہ موجود نہیں، بلکہ ہمارے اندر صرف شعوری کیفیات موجود ہیں۔ اور شعور نہ جسم ہے نہ محسوس اور نہ محسوس کر اس سے اتصال ہے، کیونکہ اتصال دو جسموں میں پایا جاتا ہے۔ غیر جسم اور جسم میں نہیں پایا جاتا۔ مزید براں محسوس پر حکم لگانا صرف حس کا فیصلہ نہیں بلکہ عقل و فکر کو بھی اس میں دخل ہے۔ مثلاً ہم نے آنکھ سے آم کے دانہ کو دیکھا جس کی وجہ سے شعاع بصری اور ہوا کے ٹکراؤ نے دماغی اعصاب کے ذریعہ ہم میں آم کی ایک شعوری کیفیت پیدا کر دی۔ اس سے قبل ہماری عقل میں دانۂ آم کا ایک کلی نقشہ موجود تھا۔ ہماری عقل نے اس کلی نقشہ کو محسوس آم کی کیفیت شعوری پر منطبق کیا، اور اس انطباق کے تحت یہ حکم لگایا، کہ یہ آم ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوا کہ محسوسات کے متعلق جس قدر فیصلے صادر ہوتے ہیں ان میں بھی عقل کو دخل ہے۔ عقل اگر صاف ہو تو ایک حد تک یہ فیصلے صحیح ہوتے ہیں۔ لیکن اگر عقل میں تعصب اور وہم کی آمیزش ہو تو حقیقت مبہم ہو جاتی ہے اور فیصلے غلط ہو جاتے ہیں جس کی عمدہ مثال مغربی مستشرقین کی تصنیفات ہیں جن میں وہ اسلام قرآن اور صاحب قرآن کو عقل اور بصیرت کی اس عینک سے دیکھتے ہیں، جس پر صلیبی جنگوں کا متعصبانہ غلاف چڑھا ہوا ہے۔ اس عینک کے تحت ان کو اسلام قرآن اور صاحب قرآن سے متعلق تمام روشن حقائق سیاہ نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں عقل صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی۔

فلسفہ | غیر مادی کائنات جو حواس کے تجربہ سے خارج ہے۔ مثلاً خالق کائنات صفات باری اور مابعد الموت کے انسانی احوال ان کے متعلق صرف عقل و دماغ سے کوئی ضابطہ یا قانون بنانا۔ اسی طرح لطیف اشیاء عقائد اعمال و اخلاق کے حسن و قبح کے متعلق عقل و فکر کے ذریعہ کوئی فیصلہ کرنا یہ سب فلسفہ کہلاتا ہے۔ مذکورہ امور میں عقل محض کے فیصلے حرف آخر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں اکثر تصادم بلکہ تناقض پیدا ہوتا ہے۔ فلسفہ مشائی فلسفہ اشراقی اور فلسفہ یورپ کے فیصلوں اور قوانین میں باہم تناقض ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عقلی معلومات کا مآخذ درحقیقت حسی معلومات ہیں۔ اور مذکورہ امور ماوراء الحس سے متعلق ہیں۔ اس لئے عقل جب ان کے متعلق کوئی قانون بنائے گی، تو محسوساتی رنگ میں بنائے گی اور نامحسوس کو محسوس پر قیاس کرے گی۔ اس لئے ایسے فیصلے میں ضرور غلطی واقع ہوگی۔ مثلاً یہ فیصلہ کہ مادہ کائنات

ازلی ہے کیونکہ اگر وہ ازلی نہ ہو تو وہ عدم محض اور خالص نیستی سے وجود میں آیا ہوگا۔ اور عدم سے کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی۔ کیونکہ پوری کائنات جوہری ذرات (مادہ) سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ہماں محسوسات میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ کوئی چیز نیست سے ہست ہوئی ہو۔ برتن مٹی سے، میز لکڑی سے، تلوار لوہے سے، عمارت چونے اینٹ سیمنٹ گارڈر لکڑی وغیرہ سے تیار ہوتی ہیں۔ مگر مادہ اگر پیدا شدہ ہو تو اس سے قبل جب کوئی مادہ تھا ہی نہیں، تو وہ خالص عدم سے کس طرح وجود میں آیا۔ آپ نے دیکھا کہ فلسفہ کا یہ فیصلہ جو عقلی کہلاتا ہے۔ درحقیقت محسوسات سے ماخوذ ہے، یعنی خدا کے غیر محسوس کے فعل وعمل کو انسان محسوس کے فعل وعمل پر قیاس کیا گیا کہ انسان چونکہ نیست سے ہست نہیں کرسکتا۔ لہذا خدا بھی ایسا نہیں کرسکتا کہ نیست سے کوئی چیز پیدا کردے۔ گویا خالق کو مخلوق پر قیاس کیا گیا۔ حالانکہ خالق کائنات تو بڑی ذات ہے، ایک مخلوق کو دوسری مخلوق پر قیاس کرنا غلط ہے۔ ہاتھی جو مخلوق ہے بیس من بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ لیکن ایک چیونٹی نہیں اٹھا سکتی۔ اب اگر چیونٹیوں کی کانفرنس یا پارلیمنٹ یہ فیصلہ کردے کہ چونکہ ہم بیس من بوجھ نہیں اٹھا سکتے تو ہاتھی بھی نہیں اٹھا سکتا تو یہ فیصلہ قطعاً غلط ہوگا۔

اسی طرح اگر انسان جو خالق کی نسبت اس سے بھی بہت کم ہے، جس قدر چیونٹی ہاتھی سے کم ہے یہ فیصلہ کردے کہ چونکہ ہم انسان نیست سے کوئی چیز ہست نہیں کرسکتے تو خدا بھی نہیں کرسکتا، تو یہ فیصلہ غلط ہی ہوگا۔ چیونٹی تو پھر بھی ہاتھی کے ساتھ بہت امور میں شریک ہے، دونوں جسم ہیں، دونوں حیوان ہیں، لیکن انسان کو تو خدا سے کوئی مناسبت نہیں۔ لہذا یہ قیاس غلط ہے، اور اس قیاس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ علم نہیں اور نہ ہی ایسی لیبارٹری ہے کہ جس میں ہم خدا کی قوت کا تجزیہ وتحلیل کرسکیں۔ اس کے علاوہ ہر حقیقت واقعیہ کے لئے مثال موجود کا مطالبہ ہی سرے سے درست نہیں۔ جارج پنجم کی تاجپوشی کا جشن دہلی میں ہوا، لیکن شاہان انگلستان میں سے اور کسی بادشاہ کا جشن تاجپوشی دہلی میں منعقد نہیں ہوا۔ اب اگر کوئی یہ کہہ دے کہ میں جارج پنجم کے جشن تاجپوشی کا دہلی میں ہونا تسلیم نہیں کرتا۔ جب تک مجھے کوئی اور مثال ایسی نہیں پیش کی جاتی کہ انگلستان کے کسی اور بادشاہ کی تاجپوشی بھی دہلی میں ہوئی ہے، تو کیا اس مطالبہ مثال سے اصل واقعہ مشکوک ہوسکتا ہے، قطعاً نہیں۔ یہی حال مادے کا ہے۔ مادہ آغاز آفرینش میں عدم سے وجود میں آیا۔ ازاں بعد پوری کائنات مسلسل مادہ کی ترتیب سے پیدا ہوتی چلی گئی۔ لہذا نیست سے ہست کا وجود صرف ایک واقعہ ہے۔ اور وہ بھی اجسام عالم کی تخلیق سے قبل جبکہ وقت نہ انسان

تھا، نہ دیگر کائنات مادہ بن چکنے کے بعد جس قدر تخلیقی واقعات ہیں، وہ سب ہست سے ہست ہونے کے واقعات ہیں۔ اس لئے جس زمانے میں انسان ہے جب وہ ہست سے ہست بننے کے واقعات کو دیکھتا ہے، اُن سے وہ یہ نتیجہ کیونکر نکال سکتا ہے کہ عالم اجسام کی تخلیق سے قبل آغازِ تخلیق مادہ کے وقت بھی نیست سے ہست ہونے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اب اگر پھر بھی مادئیین میں سے کوئی اصرار کرے کہ نیست سے ہست ہونے کے واقعہ کا ضرور ہمیں مشاہدہ کرا دیا جائے تو جواب یہ ہے کہ تم ہم کو اس زمانہ میں لے جاؤ جس زمانہ میں تخلیق اجسام عالم سے قبل جوہر مادہ کی تخلیق ہو رہی تھی تو ہم مشاہدہ کرانے کے لئے بھی تیار ہیں۔ یہ مطالبہ مشاہدہ ایسا ہے کہ کوئی شخص یہ مطالبہ کرے کہ ہمیں دارا اور سکندر کی جنگ کا مشاہدہ بیسویں صدی میں کرا لو ورنہ ہم نہیں مانتے تو اس کے جواب میں یہ کہنا پڑے گا۔ کہ ہمیں اس زمان و مکان میں پہنچا دو جہاں اور جس وقت یہ جنگ ہوئی تھی۔ تو مشاہدہ کرا دیا جائے گا۔ تاہم اسکندر فردوس یونانی نے نیست سے ہست ہونے کی صحت پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ علامہ ابن مسکویہ نے اپنی کتاب الفوز الاکبر میں اسکی رائے واضح الفاظ میں نقل کی ہے۔ کہ موم کی شکل اگر گول ہو اور پھر ہم اس میں تصرف کرکے مربع شکل میں تبدیل کریں تو پہلی صورت و شکل کروی معدوم ہو کر دوسری صورت مربع وجود میں آئی۔ اب ظاہر ہے کہ یہ مربع صورت عدم سے وجود میں آئی، پہلی صورت میں نہیں بنی۔ بلکہ وہ گم ہو گئی تو جب صورت عدم سے وجود میں آسکتی ہے۔ تو مادہ بھی عدم سے وجود میں آسکتا ہے۔ کیونکہ جوہری مادہ بسیط اجزاء ہیں جو ہر حالت میں کوئی نہ کوئی صورت رکھتے ہیں۔ کوئی مادہ صورت سے جدا نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی صورت مادہ کے بغیر موجود ہو سکتی ہے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مادہ اور صورت دونوں آغاز تخلیق میں عدم سے وجود میں آئے۔ میرے نزدیک مادئیین کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے مخلوق بالذات اور مخلوق بالواسطہ میں فرق نہیں کیا۔ تمام مادی اجسام مخلوق بالواسطہ ہیں کہ وہ مادہ کے واسطے سے خالقِ کائنات سے خلق ہوتے ہیں، لیکن خود مادہ کسی دوسرے مادے سے مخلوق نہیں ہوا۔ بلکہ خالقِ کائنات نے براہ راست اسکو خلق کیا کیونکہ اگر ہر مادے کے لئے مادہ ضروری ہو تو تسلسل محال لازم آئے گا، جو فلسفہ کے لحاظ سے درست نہیں۔ اسکی مثال یہ ہے کہ انسان مثلاً زید بالواسطہ کلام کرتا ہے، یعنی زبان کے ذریعے تکلم اور نطق کرتا ہے، لیکن خود زبان بالذات ناطق اور متکلم ہے۔ زبان کے بولنے میں وہ کسی دوسری زبان کی محتاج نہیں، بلکہ بالذات ناطق ہے اسی طرح اجسام مادیہ مخلوق ہونے میں مادہ کے محتاج ہیں لیکن مادہ مخلوق ہونے میں کسی دوسرے مادہ

کا محتاج نہیں ۔

مذہب مذہب ان امور سے متعلق ہے، جو سائنس اور فلسفے کے دائرے سے خارج ہیں۔ سائنس کا دائرہ مادیات ہیں اور فلسفے کی بنیاد ظنیات اور تخمینات ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ یونانی اور یورپی فلسفہ چونکہ غیر یقینی تھا اس لئے وہ مذہب کا استیصال نہ کر سکا۔ لیکن سائنس چونکہ مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہے۔ اس لئے مذہب اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ مذہب اور سائنس میں مقابلہ اس وقت ہوتا جب دونوں کا دائرہ عمل ایک ہوتا۔ لیکن مادیات اور ماورالمادیات دو مختلف دائرے ہیں جن میں مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سائنس جن چیزوں کا اثبات یا ابطال کرتا ہے۔ مذہب کو ان سے بالکل سروکار نہیں، عناصر کس قدر ہیں، پانی کن چیزوں سے مرکب ہے، ہوا کا کیا وزن ہے، روشنی کی رفتار کیا ہے۔ زمین کے کس قدر طبقات ہیں۔ مذہب کو ان سے کچھ تعلق نہیں، مذہب جن چیزوں سے بحث کرتا ہے، مثلاً یہ کہ خدا ہے، اور مرنے کے بعد اور ہر قسم کی زندگی ہے۔ اور نیکی اور بدی ہے۔ اور ان کے نتائج ثواب و عقاب ہیں۔ ان میں کونسی چیز ہے جسے سائنس ہاتھ لگا سکتی ہے۔ سائنس دان اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو ان کا علم نہیں یا یہ کہ یہ چیزیں تجربہ اور مشاہدہ سے باہر ہیں۔ اور ہمیں صرف ان چیزوں کا علم ہو سکتا ہے جو تجربہ میں آ سکتی ہیں۔ لیکن حقیقت ناشناسوں نے عدم علم سے علم عدم سمجھ لیا۔ حالانکہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مذہب کے دائرے میں تمام وہ امور داخل ہیں جو تہذیب النفس اور تزکیۂ قلب اور اصلاح فرد اور اصلاح معاشرہ سے متعلق ہوں۔ یا اجتماعی اور سیاسی زندگی کی اصلاح سے وابستہ ہوں۔ اس بناء پر مذہب کے لئے ضروری ہوا کہ وہ مادیات کے متعلق بھی احکام خیر و شر صادر کرے کہ فلاں فلاں حیوانات کا کھانا جائز ہے، اور فلاں فلاں کا ناجائز ہے۔ دودھ کا پیا جانا جائز ہے اور شراب کا ناجائز ہے۔ تجارت کی فلاں صورتیں جائز ہیں اور فلاں ناجائز ہیں۔ شرکتی کاروبار جائز ہے اور سود ناجائز معاشی نظام کے تحت فلاں صورتیں جائز ہیں اور فلاں صورتیں ناجائز ہیں۔ جنگ ازالۂ ظلم اور اقامت عدل کے لئے جائز اور جہاد ہے۔ اور اس کے خلاف ناجائز فرد اور جماعت کی فلاں قسم کی آزادی جائز اور فلاں ناجائز ہے۔ ایسے تمام احکام اور حدود جو مذہب حقیقی نے مقرر کئے ہیں ان سے مقصود اصلاح معاشرہ، تہذیب نفس اور عادلانہ نظام کا قیام ہے، یہ معاملہ کہ انسان کے کن افعال سے روح انسانی کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ اور کن سے روح میں فساد کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں، اور کن افعال میں روح کیلئے

زہریلے اثرات موجود ہیں۔ اور کن میں تریاقی اثرات۔ یہ سب امور سائنس کی دسترس سے باہر ہیں۔ الکلام شبلی میں یورپ کے سائنسدانوں کے اقراری حوالہ جات درج ہیں کہ روح اور منشاء حیات انسانی کی حقیقت کی دریافت سے یورپ کے سائنس دان عاجز ہیں۔ لہٰذہ قدرتی طور پر روح اور روح سے سرزد اعمال کی خاصیات کی دریافت، خالق روح اور خالق انسان کے دائرۂ علم میں داخل چیزیں ہیں۔ جس کا حقیقی فیصلہ مذہب یا الہام ہی کر سکتا ہے۔ نہ مادی علوم جن کی بڑی دلیل یہ ہے کہ مادی علوم کے علمبرداروں نے جب بھی اپنی حدود سے تجاوز کر کے غیبی اور الہامی علوم میں مخالفانہ مداخلت کی۔ تو انسانی معاشرہ انکی اس مداخلت بے جا سے درہم برہم ہوا۔ اور بالآخر حقیقی مذہب کے قوانین کیطرف ان کو مجبوراً جھکنا پڑا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ یورپ نے مادی علوم کی مدہوشی میں مادی علوم کے دائرے سے باہر قدم رکھ کر اسلام پر جو اعتراضات کئے اور جن مسائل کو نشانۂ طعن بنایا۔ آج تمدنی ضروریات کی وجہ سے خود انہوں نے اپنی یہ غلطی عملاً محسوس نہیں کی کہ ان کی تمام علمی کاوشیں نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیش کردہ خدائی قوانین کے آگے بے وقعت ثابت ہوئیں۔ یورپ نے عدل انفرادی اور اجتماعی کی غرض سے اسلام کے مقدس قانون جہاد پر اعتراض کیا۔ لیکن گذشتہ دو جنگوں میں اپنی بات کے پچ کے لیئے خون کی ندیاں بہانے اور کروڑوں مکانات کو خاکستر بنا دینے کو عملاً صحیح قرار دیا۔ یعنی یہ ثابت کر دیا کہ ظلم کرنے کے لیئے جنگ جائز اور دفع ظلم کے جہاد ناجائز ہے۔ بوقت شدید ضرورت اسلامی قانون طلاق کا یورپ نے تمسخر اڑایا۔ لیکن فطرت کی گہری ضرورتوں نے ان کو اس قانون کے تسلیم کرانے پر اس قدر آمادہ کیا۔ کہ ضرورت اور بے ضرورت سب صورتوں میں طلاق کا سلسلہ یورپ اور امریکہ میں اس قدر بڑھ گیا ہے کہ یورپ میں فی آٹھ نکاح ایک طلاق اور امریکہ میں فی چار نکاح ایک طلاق تک نوبت پہنچی۔ اسلام کے قانون تحریم شراب اور تحریم سود کو یورپ نے مانع ترقی سمجھا۔ لیکن شراب کی ڈاکٹری تحقیقات کے بعد جب شراب کے مہلک اثرات ظاہر ہوئے تو امریکہ نے کروڑوں ڈالر خرچ کر کے ۱۹۲۷ء میں بندش شراب کا اعلان کر دیا۔ لیکن جرم وگناہ پھیلانا آسان کام ہے۔ روکنا مشکل ہے۔ اس لیئے امریکہ کے تمام انتظامات بندش شراب بے اثر ثابت ہوتے۔ اور شراب نوشی کی چلائی ہوئی گاڑی رک نہ سکی اور امریکہ اس میں ناکامیاب ہوا۔ سود نے جب سرمایہ دارانہ نظام کو جنم دیا، اور عوام کی اخلاقی اور معاشی حالت تباہ ہوئی تو محققین یورپ نے اسکی قباحت کا احساس کیا۔ لیکن جو قبیح چیز ایک بار معاشرے کا جزبن جائے اس کا ہٹانا حکومت کی بھی بات نہیں۔ پیغمبر اور نبی کی

تعلیم سے ایسا ممکن ہے۔ لیکن حکومت کے قانون سے یہ ممکن نہیں کہ جو برائی معاشرے کی جڑ میں داخل ہو جائے اسکو اکھیڑ کر دور پھینکا جائے۔ اسلامی قانون میں عورتوں پر اصلاح معاشرہ کے لئے بعض فطری پابندیاں لگائی گئیں ہیں۔ یورپ نے اس کو دورِ وحشت اور بربیت کی یادگار سمجھا۔ لیکن جب یورپ کی بے لگام آزادی اور صنفی آوارگی نے وہ شکلیں پیدا کیں۔ کہ جن کے اثر سے عائلی زندگی تباہ ہوئی اور بہت شوہروں نے عورتوں کی بے لگامی سے تنگ آکر خودکشی اختیار کی۔ تو لاڈسی کو اپنی کتاب "ڈمین" میں یہ لکھنا پڑا کہ عورتوں کی آزادی سے پیداشدہ مشکلات کا واحد حل یہ ہے۔ کہ عورت کو دانایانِ مشرق (مسلم قوانین) کی نگرانی میں کنٹرول کیا جائے۔

سائنس اور مذہب کی دشمنی کا آغاز کب ہوا | یورپ نے عرب اور اندلس کے مسلم سائنس دانوں سے علم حاصل کیا۔ ورنہ اگر مسلمانوں کے ذریعہ یورپ کو سائنس کی روشنی نہ پہنچتی، تو اب تک یورپ کی حالت وہی ہوتی جو افریقہ کی وحشی اقوام کی ہے۔

صنعت

کاغذ | یورپ پر عربوں کا بڑا احسان کاغذ کا رواج ہے۔ کاغذ کے اصل موجد چینی تھے، لیکن باقاعدہ کاغذسازی کا پہلا کارخانہ مسلمانوں نے ہارون الرشید کے زمانہ میں ۷۹۴ء میں بغداد میں قائم کیا اس کے بعد مسلمانوں نے دیگر بڑے بڑے شہروں میں بھی کاغذسازی کے کارخانے قائم کئے۔ مثلاً دمشق۔ مصر۔ نیشاپور۔ شیراز۔ خراسان، مراکش، غرناطہ، قرطبہ، سسلی وغیرہ۔ لیبان تمدنِ عرب ص ۴۳۲ میں لکھتے ہیں۔ کہ کاغذ پر پہلی لکھی ہوئی تحریر جو ۱۰۰۹ء میں لکھی گئی تھی اور جو ڈیل کے کتب خانے میں محفوظ ہے، یہ کاغذ عربوں سے خریدا گیا تھا۔

قطب نما | قطب نما بھی عربوں کی ایجاد ہے، یہ آلہ قرونِ اولیٰ کے تمام تجارتی اور جنگی جہازوں میں لگا ہوا تھا۔ اسی کا کرشمہ تھا کہ ہمارے جہاز جدہ سے چین تک جاتے تھے۔ جب یہ چیزیں ہم نے یورپ کو دیں۔ تو اس کو لیکر کولمبس بحر اطلس کی لہروں کو چیرتا ہوا امریکہ جا پہنچا، اور واسکوڈے گاما نے ہندوستان دریافت کیا۔

بارود | مسلمان صدیوں سے بارود استعمال کرتے تھے، سسلی اور سپین کے کارخانوں میں دیگر اسلحہ جنگ کے علاوہ ایک مسالہ بوتلوں میں بھرا جاتا تھا، جنہیں مشینوں کے ذریعے دشمنوں پر پھینکا جاتا تھا۔

توپ | توپ کو پہلے افریقہ کے سردار یعقوب نے ۱۲۰۵ء میں استعمال کیا۔ یورپ کے مورخ بارود کے موجد راجر بیکن کو قرار دیتے ہیں جو کہ غلط ہے۔ بیکن نے بارود سازی ایک عربی کتاب المیزان المحرقہ جلانے والی گیس سے سیکھی تھی۔ ملاحظہ ہو تمدن عرب صفحہ ۴۲۳ مصنفہ لیبان۔

کلاک اور گھڑیاں | ہارون الرشید نے شارلیمان کو ۷۶۰ء میں جو تحائف دیئے اس میں ایک گھڑی بھی تھی سلطان کامل نے فریڈرک کو جو تحائف ۱۱۹۹ء میں دیئے اس میں ایک گھڑی تھی جسمیں شمس و قمر حرکت کرتے تھے۔ اور طلوع اور غروب کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ اور ہر گھنٹہ پر ٹن ٹن کی آواز آتی تھی۔

ہوائی جہاز | ول ڈیوران ایج آف فیتھ صفحہ ۲۹۰ میں لکھتا ہے کہ سپین کے مسلم سائنس دان نے تین چیزیں ایجاد کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ اول عینک کا شیشہ۔ دوم وقت ناپنے والی گھڑی جو کھیلوں اور دوڑنے میں استعمال ہوتی تھی، سوم ایک مشین جو ہوا میں اڑ سکتی تھی۔

چیچک کا ٹیکہ | یہ بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ ۱۷۲۱ء میں لیڈی ورٹلی مارٹنگ نے قسطنطنیہ جاکر چیچک کا ٹیکہ سیکھا۔ ملاحظہ ہو میراث عرب صفحہ ۳۴ مصنفہ ڈریپر۔ بعض کاریگر ایسی قیمتی چیزیں بناتے تھے، جو امراء بھی خرید نہیں سکتے تھے۔ ہارون الرشید کا وزیر اعظم یحییٰ بن خالد برمکی بازار سے گذرا۔ اسکی نظر ایک مرصع صندوقچے پر پڑی۔ اس نے پسند کیا۔ اور خریدنے کا ارادہ کیا۔ لیکن قیمت پر اتفاق نہ ہو سکا۔ یحییٰ ستر لاکھ درہم دیتا تھا۔ اور دکاندار زیادہ مانگتا تھا۔ ایج آف فیتھ صفحہ ۳۰۷

مہ نخشب | نخشب ترکستان میں ایک گاؤں کا نام تھا، جہاں حکم بن ہاشم نے دعوے نبوت کیا۔ اس نے ایک چاند بنایا تھا جو غروب آفتاب کے بعد فوراً ایک کنوئیں سے نکلتا تھا۔ اور تقریباً سو مربع میل علاقہ کو رات بھر منور کرتا تھا اور طلوع آفتاب سے پہلے ڈوب جاتا تھا۔ اس ایجاد کا کمال یہ تھا۔ کہ کوئی موسم بھی ہو، جونہی سورج کا آخری حصہ پنہاں ہوتا وہ چاند نکل آتا۔ آدھی رات کو عین سر پر آجاتا۔ اور رفتہ رفتہ اس رفتار سے واپس جاتا کہ اس کا آخری کنارہ کنوئیں میں غائب ہو کر سورج نکل آتا۔ سورج سے کبھی اس کا سامنا نہیں ہوا۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

چھوڑا مہ نخشب کیطرح دست قضا نے　　خورشید ابھی اس کے برابر نہ ہوا تھا

مطلب یہ ہے کہ دست قضا یعنی خدا نے سورج کو حکم دیا کہ مہ نخشب کی طرح نکلو اور ڈوبو، اور صورت یہ تھی کہ ابھی وہ حسن و جمال میں میرے محبوب کے برابر نہ ہوا تھا۔ مہ نخشب کا موجد مدعی نبوت بغداد میں ملازم تھا۔ اس نے بغداد میں سائنس پڑھی تھی مسلمانوں کی سائنس کی مہارت کا یہ کمال اس

وقت تھا جبکہ یورپ والے کھالیں پہنتے تھے اور جنگلی وحشیوں کیطرح زندگی بسر کرتے تھے۔ مسلمانوں نے سائنس میں اتنی ترقی کی تھی۔ کہ انہوں نے ابن الہشیم پیدا کیا جو دو سو کتابوں کے مصنف ہیں اور جس نے بطلیمس اور اقلیدس کے اس نظریہ رویت کی تردید کی کہ رویت اس شعاع سے ہوتی ہے جو آنکھ سے نکلکر مرئی تک جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ مرئی کا عکس آنکھ تک آتا ہے۔ ول ڈیوران ایج آف فیتھ کے صفحہ ۲۸۹ پر لکھتے ہیں۔ راجر بیکن موجد دوربین جو طبیعات میں بلند مقام رکھتا ہے، لیکن اگر ابن الہشیم نہ ہوتا۔ تو راجر بیکن کا نام ونشان تک نہ ہوتا۔ ابن ہشیم حسن بن حسن بن الہشیم بصرہ کا رہنے والا ہے۔

علم الکیمیا　جابر بن حیان علم کیمیا کا بابا آدم سمجھا جاتا ہے۔ علم کیمیا پر اس نے سو کتابیں لکھی ہیں۔ اسکی کتاب الکیمیا کا لاطینی اور فرانسیسی میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ مسٹر ابودس نے جابر کی نو کتابوں کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔

میڈیکل سائنس　اس فن کے مجدد محمد بن زکریا رازی ہیں۔ جو دو سو کتابوں کے مصنف ہیں۔ ایک کتاب چیچک اور خسرے پر لکھی ہے۔ جو لاطینی اور دیگر یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔ ایک کتاب زمین کی ساخت پر لکھی۔ اور ایک کتاب اس پر لکھی کہ زمین فضا میں کیوں معلق ہے۔ اسکی کتاب الحاوی بیس جلدوں میں ہے۔ جسکا انگریزی ترجمہ ۱۸۶۶ء تک چالیس مرتبہ چھپا۔ یعقوب کندی ۸۵۰ء نے سائنس کے مختلف شعبوں پر ۲۲۵ کتابیں لکھی ہیں۔ اسی طرح ابونصر محمد بن فارابی ۹۵۱ء نے فلسفہ اور سائنس کے مختلف شعبوں پر کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے کشف الظنون میں ایک سو چودہ تصانیف کے نام درج ہیں۔ ابن سینا ۹۸۰ء سے ۱۰۳۷ء ایک سو پندرہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ طب میں قانون چودہ جلدوں میں لکھی۔ پندرھویں صدی کے اخیر میں تیس مرتبہ شائع ہوئی۔ یہ کتاب صدیوں تک یورپ کے نصاب میں داخل رہی۔ ڈاکٹر ولیم آسلر القانون کو طب کی بائبل کہا کرتا تھا۔ ابن طفیل، ابوبکر بن عبدالمالک بن محمد بن طفیل ۱۱۸۵ء غرناطہ کے طبیب اور فلسفی جو بعد میں وزارت کو پہنچے۔ انکی تمام تصانیف پادریوں نے جلادی تھیں۔ صرف اس کا ایک فلسفیانہ ناول حی بن یقظان باقی رہ گیا۔ اس کتاب کو ایڈورڈ پوکاک نے لاطینی میں منتقل کیا۔ اس کا ڈچ ترجمہ ۱۶۷۲ء میں روسی ترجمہ ۱۹۲۰ء میں اور سپینی ترجمہ ۱۹۳۴ء میں ہوا۔

الغرض اگر مسلمان سائنس دانوں کی تاریخ لکھی جائے، تو صرف ان کے ناموں کے لئے کئی جلدیں درکار ہیں۔ مسلمان سائنس دان صرف یونانی سائنس دانوں کو زندہ کرنے والے نہیں تھے، بلکہ

جدید سائنسی تحقیقات کے موجد تھے۔ رابرٹ بریفالٹ تشکیل انسانیت میں لکھتا ہے۔ سائنس سے مراد تحقیق کی نئی روح، تفتیش کے نئے طریقے اور پیمائش اور مشاہدے کے نئے اسلوب ہیں، جن سے یونانی بے خبر تھے۔ اس روح اور ان اسالیب کا یورپ میں رائج کرنے کا سہرا عربوں کے سر ہے۔ ملخص تشکیل انسانیت صـ۲۴۷ اور صـ۲۴۶ میں لکھتے ہیں کہ اگر عرب نہ ہوتے تو عصر رواں کی مغربی تہذیب جنم نہ لیتی۔ یورپی نشو و نما کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں اسلامی تہذیب کا یقینی سراغ نہ مل سکے۔ یہ صحیح ہے کہ عربوں نے کوئی کاپرنیکی یا نیوٹن پیدا نہیں کیا۔ لیکن عربوں کے بغیر کاپرنیکی یا نیوٹن کا پیدا ہونا بھی ناممکن تھا۔ تشکیل انسانیت صـ۲۴۶۔

ڈاکٹر ڈریپر لکھتے قرون وسطیٰ میں سائنس کی ترقی مسلمانوں کی بدولت تھی۔ اس وقت عیسائی دنیا پر جہل و اوہام کی تاریکی محیط تھی، اور انہیں علمی مشاغل کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔ ملاحظہ ہو کتاب معرکہ مذہب و سائنس صـ۲۲۱ بریفالٹ کہتے ہیں۔ بازنطینیوں نے ہزار سال گذار دئے اور تہذیب اور ارتقا میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ جس روشنی سے چراغ تہذیب پھر روشن ہوا وہ رومی دیونانی ثقافت کے ان شراروں سے نہیں نکلی تھی جو یورپ کے کھنڈروں میں سلگ رہے تھے۔ بلکہ اسے عرب اپنے ساتھ لائے تھے۔ صـ۳۵۱

آرنلڈ لکھتے ہیں۔ عربی کتابوں کے سینکڑوں تراجم یورپ کی برباد زمین پر بارش بن کر برسے اور مختلف شعبہائے علم نے انگڑائی لی۔ میراث اسلام صـ۳۵۱۔ لیبان کا قول ہے یورپ نے عربوں سے تہذیب حاصل کی۔ یورپ میں عربوں کے علوم سپین سسلی اور اٹلی کی راہ سے پہنچے اگر عربوں کا نام یورپ کی تاریخ سے نکال دیا جائے۔ تو یورپ کی حیاۃ ثانیہ کئی سو سال پیچھے جا پڑتی ہے۔ تمدن عرب صـ۵۱۳

فریڈرک دوم نے مسلمانوں کے علوم سارے یورپ میں پھیلائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو ملک اس کے زیر نگین نہ تھے۔ اس میں بھی علمی تحریک پیدا ہو گئی۔ اور وہ یورپ جس پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ابن رشد کے فلسفہ ابن البیکار کے علم نباتات ابو القاسم کے علم جراحی ابن العوام کے علم زراعت ابن الخطیب کے علم تاریخ سے آشنا ہو گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ عصر رواں کی تمام ایجادات و برکات عربوں کے طفیل ہیں۔ ملخص ایس پی سکاٹ از اخبار الاندلس ترجمہ ہسٹری آف دی مورش امپائر جلد ۲ صـ۵۸، صـ۱۰۵۔ یہ حقیقت ہے کہ علم الفلک دریاضیات کے بانی یحییٰ بن ابی منصور رصد کا محمد بن ابراہیم فزاری محمد بن جابر بتانی جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر بطلیموس زندہ ہوتا۔ تو ان کی تحقیقات کی

داد دیتا۔ علی بن یحیٰ اسی طرح لابی محمد بن موسیٰ خوارزمی جو یورپ کے ماہرین ریاضیات کے بالواسطہ استاد ہیں۔ علم جغرافیہ کے بانی ابن فرداذبہ ۔ صاحب کتاب المسالک والممالک ہیں۔ جو پنجاب یونیورسٹی میں محفوظ ہے اور ایک نسخہ مکتبہ ظاہریہ دمشق میں ہے۔ دوم جغرافیہ دان ابن واضح یعقوبی جسکی کتاب البلدان سے بڑھ کر کوئی جغرافی کتاب نہیں۔ یہ کتاب لندن میں چھپی ہے اور ایک نسخہ قلمی مکتبہ ظاہریہ دمشق میں موجود ہے۔ اسی طرح اصطخری مقدمہ عقوبس ابن حوقل ابن جبیر یاقوت حموی کی کتابیں جو عہد عباسی میں لکھی گئیں۔ یورپ کے بڑے مشعل راہ ہیں۔ تہذیب و تمدن اسلامی حصہ دوم اختر ندوی صـ۹۵ بحوالہ نکلسن لٹریری ہسٹری صـ۴۱۹ ڈوزی جلد دوم صـ۱۵۴ میں لکھا ہے کہ آجتک کوئی ملک ایسا نہیں جس کے باشندے سو فیصد لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ لیکن آج سے ہزار سال قبل اسلامی اندلس کے کل باشندے لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اس وقت یورپ میں ایک فیصدی آبادی بھی لکھی پڑھی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ پادری دستخط کرنا نہیں جانتے تھے، وہ دستخط کی بجائے عشاء ربانی کی شراب میں انگلی ڈال کر کاغذ پر دھبے ڈالتے تھے۔ یہ اسکاٹ کا بیان ہے کہ عام کتابیں کیا انجیل تک نایاب تھی۔ بادشاہ فرانس نے اپنا اسلحہ اور سامان گروی رکھکر ایک گرجا سے انجیل تک رسائی حاصل کی۔

ملکہ ازابیلہ کے قابل فخر کتب خانہ میں ۲۰۱ کتابیں تھیں لیکن اس ملکہ سے ساڑھے چار سو سال پہلے الحکم کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں تھیں جن میں سے اکثر وہ پڑھ چکا تھا۔ عبد الرحمٰن الداخل نے دوسری صدی میں قرطبہ کا سنگ بنیاد رکھا اور ہشام اور حکم نے اس کو عروج بخشا۔ ان میں وہ علوم پڑھائے جاتے تھے کہ تیرہ سو سال میں ان پر اضافہ نہ ہو سکا۔ دینی علوم کے علاوہ طب، جراحت، سائنس ادویہ سازی۔ نجوم ہیئت۔ جغرافیہ۔ حساب ہندسہ کا درس اس یونیورسٹی میں ہوتا تھا قرطبہ میں تعلیم پانے والوں کی تعداد گیارہ ہزار تھی اور آٹھ مدارس ان سے ملحق تھے۔ ابتدائی تعلیم کا انتظام ہر گاؤں کی مسجد سے متصل مدرسہ میں ہوتا تھا۔ قرطبہ کے ابو القاسم بحر بطی تمام یورپ کے بالواسطہ استاد تھے۔ ایسی یونیورسٹیاں طلیطلہ۔ غرناطہ۔ اشبیلہ میں بھی تھیں۔ اسلامی ممالک میں جس وقت سائنس کے چراغ روشن تھے۔ شاندار عمارتیں اور صاف پختہ سڑکیں موجود تھیں، یورپ کا یہ حال تھا کہ ڈریپر معرکہ مذہب و سائنس صـ۲۶۱ میں لکھتا ہے کہ ۸۰۶ء میں یورپ کا بیشتر حصہ لق و دق بیابان یا بے راہ جنگل تھے۔ جا بجا دلدل اور غلیظ جوہڑ تھے۔ لندن اور پیرس جیسے شہروں میں لکڑی کے ایسے مکانات تھے جن کی چھتیں گھاس کی تھیں۔ امراء بھینس کے سینگ میں شراب ڈال کر پیتے تھے۔

گلیوں میں فضلے کے ڈھیر لگے رہتے تھے، سڑکوں پر بے اندازہ کیچڑ پڑا رہتا تھا۔ سالہا سال تک کپڑے نہ دھوتے تھے، نہانا اتنا بڑا گناہ تھا کہ پاپائے روم نے سسلی اور جرمنی کے بادشاہ فریڈرک ثانی پر کفر کا فتویٰ لگایا، تو فہرست الزامات میں یہ بھی درج تھا۔ کہ وہ ہر روز مسلمانوں کی طرح غسل کرتا ہے ڈاکٹر ڈریپر معرکہ سائنس صد ۲۲۵ میں لکھتا ہے کہ ۱۳۵۰ء میں جب وہ روم گیا تو وہاں جا بجا غلاظت کے ڈھیر اور گندے پانی کے جوہڑ تھے۔ سترھویں صدی میں برلن کی یہ حالت تھی کہ بازاروں میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے رہتے تھے۔ مگر یورپ کی اس حالت سے آٹھ سو سال پہلے مسلمانوں کے ایسے مکانات اسپین، مصر، شام، بغداد میں موجود تھے، جن کی نظیر آج بھی دنیا میں نہیں مل سکتی اور تعلیم اور صفائی کا اتنا چرچا تھا جو بے مثل تھا۔ اب معاملہ بالکل بالعکس ہوا۔

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو ترس گئے ہیں وہ ایک جلوۂ شرر کیلئے

تاریخ کا قطعی فیصلہ ہے کہ اگر مسلمان سپین اور سسلی نہ جاتے، تو یورپ بربریت، ہلاکت جہالت غنڈہ گردی اور بد اخلاقی سے کبھی نہ نکل سکتا، مسلمانوں نے یورپ کو ایک تابدار تمدن، عظیم الشان تہذیب، بیشمار درسگاہیں اور ہر قسم کے علوم دئے، انہیں کپڑے پہننا، نہانا، کھانا انسانوں کی طرح رہنا سہنا سکھایا، لیکن جب سپین کی اسلامی حکومت کا ۱۴۹۲ء میں خاتمہ ہوا تو عیسائی بادشاہ نے مسلمانوں کے ان احسانات کا جو بدلہ دیا وہ یہ ہے۔ کہ ان کے سرکردہ افراد کو مذہبی عدالت سے ۲۸۵۴۰ کو موت کی سزا دی گئی۔ ۱۲۰۰۰ ہزار کو زندہ جلا دیا گیا، ان کی سینکڑوں لائبریریاں جن میں لاکھوں کتابیں تھیں، سپردِ آگ کر دی گئیں ۱۵۵۶ء میں فلپ دوم نے سارے حمام بند کر دئے ۱۶۱۰ء میں تمام مسلمانوں کو ترکِ ملک کا حکم مل گیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے۔ کہ سپین کے ڈیڑھ لاکھ عربوں کا ایک قافلہ بندرگاہ کیطرف جا رہا تھا۔ کہ بلیڈا نامی ایک پادری نے غنڈوں کو ساتھ ملا کر اس قافلہ پر حملہ کیا اور ایک لاکھ آدمی مار ڈالے۔ پھر گھروں، بازاروں، گلیوں میں مسلمانوں پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ یہاں تک کہ ۱۶۳۰ء میں ایک بھی مسلمان سپین میں باقی نہ رہا۔

عیسائیت کی علم دشمنی

۱۔ چوتھی صلیبی جنگ میں صلیبی لشکر قسطنطنیہ پہنچا۔ تو اس نے وہاں کی تمام عیسائی آبادی کو لوٹا، اور ساری کتابیں جلا دیں۔ ملاحظہ ہو تمدن عرب مصنفہ۔ لیبان صد ۳۴۳

۲۔ طرابلس میں اس دور کی عظیم ترین لائبریری تھی جس میں کتابوں کی تعداد تیس لاکھ تھی۔ جب صلیبی لشکر طرابلس پہنچا تو اس نے کتب خانہ کو آگ لگا دی۔ اور کل کتابیں جلا دیں۔ اور مسلمانوں کی چھ سو سال کی محنت کو تباہ کر دیا۔ ملاحظہ ہو معرکۂ مذہب و سائنس صد ۱۵

۳- جاہل اور وحشی عیسائی بادشاہوں نے اس زمانہ میں جبکہ اہل علم کا شدید قحط تھا، مسلمانوں کی ساٹھ لاکھ سے زیادہ کتابیں جلادی گئیں۔ معرکہ مذہب وسائنس ص ۳۹۹ یورپ کے مختلف حصوں میں جو کچھ ہوا۔ باقی کسر تاتاریوں نے پوری کی۔ تیرھویں صدی میں انہوں نے بغداد، کوفہ، بصرہ، حلب، دمشق، نیشاپور، خراسان، خوارزم، شیراز کی سینکڑوں لائبریریاں تباہ کرڈالیں جن کی کتابوں کی مجموعی تعداد تین کروڑ سے زیادہ تھی، یورپ پر اسلام کا احسان ص ۹۔

۴- ۴۷۶ء زوال روما کے بعد پاپائیت برسر اقتدار آئی۔ اور لوتھر کے خروج ۱۵۲۶ء تک وہ سیاہ وسفید کی مالک رہی۔ پوپ مذہبی ادب کے بغیر تمام انواع علوم کا دشمن تھا۔

۵- یونان کی ایک لڑکی ہیشیا جو اسکندریہ ۴۱۴ء میں تعلیم پاکر فلسفی اور سائینسدان بن گئی۔ اسکندریہ کے بشپ سائرل کے کارندوں نے سائرل کی تکفیر کی وجہ سے اس لڑکی کو ننگا کرکے اسکی کھال کھرچی اور اسکی لاش کے ٹکڑے کئے۔ معرکہ مذہب وسائنس ص ۴۷ وتمدن عرب ص ۹۲۔

۶- فلارنس اٹلی کا مشہور ہیئت دان تھا، جو دوربین کے موجد ہیں۔ گلیلیو کے متعلق پوپ نے جب سنا کہ اس نے کاپرنیکی ۱۵۴۳ء کے نظام شمسی کی تائید کی ہے۔ تو اس کو مذہبی عدالت کے آگے پیش کیا۔ وہاں اس نے ڈر سے توبہ کرلی لیکن ۱۶۳۲ء میں جب اس نے اپنی کتاب نظام عالم تصنیف کی تو پوپ نے اس کو جیل میں پھینک دیا۔ وہ دس سال انتہائی تکلیف اٹھانے کے بعد ۱۶۴۲ء میں فوت ہوا۔ ملاحظہ ہو معرکہ مذہب وسائنس ص ۲۳۷۔

۷- اٹلی کا مشہور فلسفی برونو کو جو فلسفہ ابن رشد کا پیرو تھا، عیسائی مذہبی عدالت نے اسکو ۱۶۰۰ء میں زندہ جلادیا۔ معرکہ مذہب وسائنس ص ۲۲۸۔

۸- ڈریپر نے دو اور علماء دیتی اور ہیردش کا ذکر کیا ہے، کہ کلیسا نے ان کو زندہ جلادیا۔

۹- دان ڈی ڈائیس سائینسدان کو کلیسا نے جیل میں ڈال دیا وہیں فوت ہوا۔ بعد از مرگ اسکی لاش کو اسکی تصانیف کے انبار پر رکھ کر جلادیا۔ معرکہ مذہب وسائنس ص ۴۲۔

یورپ کا تعصب اور علمی خیانت | اس میں شک نہیں کہ یورپ نے ہزار سال ہم سے درس لیا۔ اور اتنے سال اُن کے ہاں ابن رشد ابن سینا۔ محمد بن زکریا رازی کی کتابیں داخل نصاب رہیں۔ لیکن فطری تعصب کی وجہ سے وہ ہمیشہ مسلمانوں کے اس احسان کو چھپاتے رہے بلکہ علمی خیانت کا ارتکاب کرتے رہے۔ ہماری ایجادات کو اُن یورپی سائینسدانوں کیطرف منسوب کیا، جنہوں نے سب سے پہلے ہماری ایجادات کا تذکرہ کیا۔ تشکیل انسانیت مصنفہ برلغالٹ ص ۵۲۔

خیانت کا یہ حال ہے کہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لفظ جیبر (جابر) کے تحت ایک ایسے مترجم کا نام دیا ہوا ہے جس نے مسلمان بانی علم الکیمیا جابر بن حیان کی کتاب الکیمیا کا لاطینی میں ترجمہ کیا اور اس کو اپنی تصنیف بنا لیا۔ یہی حرکت قسطنطین افریقی مسیحی نے ۱۰۶۰ء میں کی کہ ابن الجزار کی کتاب زاد المسافرین کا لاطینی ترجمہ کر کے اس کو اپنی تصنیف ظاہر کیا۔ میراثِ اسلام آرنلڈ طب و سائنس۔

موسیو لیبان نے اس حقیقت کا اعتراف کیا۔ کہتا ہے: ہمیں اسلام اور پیروانِ اسلام سے تعصب وراثت میں ملا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں یہ بات راسخ کر دی گئی ہے کہ ہمارے تمام علوم و فنون کا ماخذ یونان ہے۔ اور یورپ کی تہذیب میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ ہم میں سے بعض کو یہ بات کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ کہ ہماری ترقی اور تہذیب کا باعث ایک کافر قوم تھی۔ تمدنِ عرب ص۵۴۲

رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے۔ یورپی مؤرخ مسلمان کو کافر کتا سمجھتا ہے۔ اور اس کا احسان ماننے کو تیار نہیں۔ یورپ کی احیائے نو کی تاریخیں برابر لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن ان میں آن عربوں کا ذکر موجود نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ کہ ڈنمارک کی تاریخ میں ہیملٹ کا ذکر نہ آئے۔ ڈاکٹر روز برل نے تو کمال ہی کر دیا۔ کہ قرونِ وسطیٰ کی ذہنی ارتقاء پر دو جلدیں لکھیں اور اسلامی تہذیب کیطرف اشارہ تک نہیں کیا۔ تشکیلِ انسانیت ص۲۷۵۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کی تہذیب کو صرف اسلامی تہذیب ہی شکست دے سکتی ہے۔ جو مادی اخلاقی علمی اور جوشِ عشق انفرادی و اجتماعی کی توانائیوں کے اسلحہ سے آراستہ ہے۔ اس کے خلاف ہندو و بدھ تہذیب اوہام و خرافات کا مجموعہ ہے۔ اس لئے یورپ نے سب تہذیبوں کے برخلاف صرف اسلامی تہذیب کو نشانہ تعصب بنایا۔ مسیحی اور یہودی دنیا اربوں روپیہ سالانہ خرچ کر کے مسلمانوں کی مرکزیت اور وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں صرف کر رہی ہے۔ تاکہ یورپ کی یہ حریف قوت ہمیشہ زبوں حالی، خانہ جنگی، افتراق و تشتت میں مبتلا رہے۔ اور مدت مدید سے اسی آزمودہ نسخہ کو یورپ ہماری تباہی کیلئے استعمال کر رہا ہے۔ اور ہمیں ہوش نہیں۔ ترک اور عرب کا افتراق اور پھر عربوں کا باہمی افتراق۔ پاکستان مشرقی اور مغربی کا افتراق اور پاکستان میں پٹھان۔ پنجابی سندھی اور بلوچی کا افتراق۔ یہ سب یورپ کی استعماری سازش کے کارنامے ہیں۔ ہم سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یورپی تہذیب دم توڑ رہی ہے وہ ایک بے جان لاش ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کو زندگی کے جو چند لمحات حیات نصیب ہوتے ہیں۔ وہ صرف دولت اور اسلحے کے سہارے سے ملے ہیں۔ اسلحہ اور دولت کا یہ انجکشن اس مریضِ نیم جان کی حقیقی صحت لوٹانے کیلئے کافی نہیں۔ بلکہ اس انجکشن کی مثال ڈاکٹر کے اس انجکشن کی طرح

ہے۔ جو مریض میں اتنی قوت پیدا کر دے کہ ہسپتال سے گھر تک سلامت پہنچ سکے۔ یورپ کو یہ یقین ہے کہ مسلمانوں کی قوت کے دو سرچشمے ہیں، ایک دینِ فطرت دوم وحدت و مرکزیت۔ دونوں کے خلاف وہ برسرِ پیکار ہے۔ دینِ فطرت یعنی اسلام استعمار زر اندوزی، مکر و فریب، لوٹ گھسوٹ، شہوانی اور غضباتی زندگیوں کی سیاہ کاریوں اور انسان کشی کو برداشت نہیں کرتا، وہ انسانی جذبات و عواطف کو خالقِ کائنات کی ذات اور آخرت سے جوڑتا ہے۔ اور تمام فکری اور عملی انتشار کو اسلامی فکر و عمل کی وحدت کے ذریعے ختم کرتا ہے۔ اس لئے یورپ جس طرح مسلمانوں کی وحدت تباہ کرنے پر بےشمار دولت صرف کرتا ہے، اسی طرح فتنۂ استشراق اور فتنۂ استغراب کے ذریعہ اسلامی تعلیمات میں خود مسلمانوں کے ہاتھوں تحریف کی کوشش کرتا ہے، تاکہ تحریف شدہ اسلام مسیحی دنیا کی طرح بے جان لاش بن کر رہ جائے۔

مذہب اور حکومت مسیحی مذہب کی شروع سے یہ آواز مسیحی دنیا کے کان میں گونجتی تھی، جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو، اور جو قیصر کا ہے، وہ قیصر کو دو۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی ‏ ‏ ‏ سماتی کہاں اس فقیری میں امیری

دوم یہ کہ اسلام میں پہلی صدی میں تمام علوم اور بالخصوص سائنسی تحقیقات کا آغاز ہوا اور تاریخِ اسلام میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں مل سکتا۔ کہ ان تحقیقات پر مسلمانوں نے کبھی اعتراض کیا ہو، یا کسی سائنسی نظریہ یا ایجاد پر کسی کو سزا ملی ہو، یا کوئی سائنسی کتاب جلادی گئی ہو لیکن اسلام کے برخلاف مسیحیت نے علمی اور سائنسی تحقیق کو موجبِ قتل جرم قرار دیا۔ اور لاکھوں سائنسی کتابیں جلادی گئیں۔ اور ہزاروں سائنسدانوں کو سائنسی تحقیق کے جرم میں قتل کیا گیا۔ اور زندہ جلادیا گیا۔ اب جدید علوم یورپ کے سامنے مسیحی دین تھا۔ جو سائنس اور علوم کا دشمن تھا، لہٰذہ اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کہ دین کو حکومت سے خارج کر دے۔ اور اس کی قوت کو کمزور کر دے۔ صرف اس کا نام باقی رہے جو استعماری مقاصد کے لئے مشنریوں کے ذریعہ اس سے کام لیا جا سکے۔ لیکن اسلام جو دینِ فطرت اور سائنس سے ہم آہنگ ہے اور اسلام ہی دنیا میں سائنسی علوم کا سب سے بڑا داعی ہے۔ اور دنیا میں سائنس پھیلانے کا بڑا محرک ہے۔ اور دینِ فطرت اور دینِ کامل ہونے کی وجہ سے زندگی کے ہر شعبے معاشرتی اخلاقی، سیاسی اجتماعی معاشی کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ اور انسانی فلاحِ عمومی کا واحد ذریعہ ہے۔ لہٰذہ یہ حماقت ہے کہ مسیحیت کا قانون اسلام پر حاوی کیا جائے اور اسلام کو بھی اپنی بلندی سے اتار کر مسیحی سطح پر لاکر انسانیت کو اسکو روشنی سے محروم کیا جائے۔ ایسا کرنا اسلام پر نہیں بلکہ انسانیت پر ظلمِ عظیم ہوگا۔ جسکی تصدیق گذشتہ تاریخی واقعات کے علاوہ ہم قرآن کی اندرونی شہادت سے بھی پیش کر سکتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

پاکستان بھر میں اسلامی علوم و فنون کا مثالی ادارہ ہے، جہاں شعبہ عربی میں ملک و بیرون ملک کے چار سو طلبہ اور شعبہ تعلیم القرآن (مڈل سکول) میں چھ سو طلبہ (مجموعی ایک ہزار طلبہ) کو علوم دینیہ سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دار الافتاء، شعبہ تجوید و قراءت، اردو خط و کتابت، تبلیغ و تصنیف وغیرہ کے مستقل شعبے مصروف کار ہیں۔ دینی اقدار کی اشاعت و تحفظ کی غرض سے "الحق" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی شائع ہوتا ہے۔ طلبہ دار العلوم کے مصارف، قیام و طعام، روشنی، صابن، کتب، ادویہ وغیرہ کا دار العلوم کفیل ہے۔ دار العلوم کے تنظیمی اور تعلیمی اخراجات تقریباً دو لاکھ روپے سالانہ ہیں، جو صرف عامۃ المسلمین، اہل خیر حضرات کے تعاون سے پورے ہوتے ہیں۔ دار العلوم کے انتظامات کی نگرانی ایک با اختیار مجلس شوریٰ کے سپرد ہے۔ اس قلیل عرصہ میں ایک ہزار سے زائد علماء فارغ ہو کر ملک و بیرون ملک میں مختلف دینی، علمی، ملی مشاغل میں مصروف ہیں۔ دار العلوم کی سند پاکستانی افواج میں تسلیم شدہ ہے۔ نیز جامع ازہر مصر وغیرہ میں اسے مماثل بی۔ اے قرار دیا گیا ہے۔ اس وقت کئی اہم تعلیمی، تبلیغی اور تعمیری منصوبے وسائل نہ ہونے کی وجہ سے تشنۂ تکمیل اور مسلمانوں کے بھرپور تعاون کے محتاج ہیں۔ التماس ہے کہ رجب، شعبان، رمضان کے موقع پر دین کے اضمحلال کے اس دور میں اس ادارہ کو زیادہ سے زیادہ امداد سے نواز کر اس دینی مرکز کے ترقی و استحکام کا باعث بنیں۔ خود بھی اور اپنے حلقہ اثر و رسوخ سے بھی کوشش فرما کر اس مہمانخانہ علوم نبوتؐ کو زیادہ سے زیادہ خدمت دین کا موقع فراہم کریں۔

نوٹ :- مرکزی حکومت پاکستان کی وزارت مالیات سے رجسٹریشن نمبر (۹۰۔ سی۔ اے (۴۲) آئی ٹی پی۔ ۵۵) کے ذریعہ دار العلوم کے ملنے والے تمام عطیات کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ جس مد میں رقم بھیجی جائے اسکی صراحت کر دی جائے۔ متعلقین دار العلوم آپ کے اس مخلصانہ عطیہ کے تہِ دل سے شکر گزار ہوں گے۔ واجرکم علی اللہ تعالیٰ

ترسیل زر کا پتہ :- مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور۔ مغربی پاکستان

منجانب :- **اراکین دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک** ضلع پشاور

مولانا سید عبد الشکور ترمذی، ساہیوال

اسلام میں معاشی مسئلہ کا اخلاقی حل

سوشلزم اور سرمایہ داری نظام کے فساد کا اصل سبب

معاشی مسائل و مشکلات کا اسلامی اور اخلاقی حل یہ معلوم ہوا کہ دنیا کی فانی اور عارضی زندگی کو آخرت کی غیر فانی اور ابدی زندگی کے تابع رکھا جائے۔

"معاش" اسطرح "معاد" کے ساتھ جوڑ دینے اور بالکلیہ اس کے تابع اور ماتحت کر دینے کی صورت میں معاشی مسائل و مشکلات اس معنی میں اور اس حد تک سرے سے مسائل و مشکلات ہی نہیں رہتے جس معنی میں اور جس حد تک "غیر معادی" معاشیات نے ان کو سمجھ اور بنا رکھا ہے۔

معاشی حل کے دو خالص روحانی عنصر ۱۔ جو حقیقی رزق رساں ہے اور رزق رسانی کی اسباب اور بغیر اسباب، تدبیر اور بغیر تدبیر، ہر طرح پوری قوت و قدرت رکھتا ہے، اسکی رزاقیت یا رزاقی ضمانت پر اعتماد و اطمینان کرنا۔

۲۔ اس اطمینان و اعتماد کے باوجود اگر انفرادی یا اجتماعی طور پر "معاش" کی کوئی وقتی طور پر تنگی ترشی یا مشکل پیش آئے تو اس کو "معاد" یعنی آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلہ میں نہ صرف حقیر و بے بساط بلکہ بصیر بالعباد کی بندہ پروری کی عین حکمت و مصلحت پر مبنی جاننا۔

دو تدبیری حل معاش کے مقابلہ میں معاد کے ابدی فوز و فلاح کی اہمیت اور خدا کیطرف سے رزقی ضمانت کے اس دوگونہ روحانی حل ہی پر مبنی اب دو تدبیری حل بھی لیجئے۔

۱۔ ہزار تدبیروں کی ایک تدبیر اور سارے معاشی وسائل و اسباب سے بڑا وسیلہ اور سبب خود مسبب الاسباب (خدا تعالیٰ) کی رضا جوئی و خوشنودی کی فکر و سعی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ اسی فکر و سعی کا نام قرآن مجید کی زبان میں تقویٰ یعنی پرہیزگاری کی زندگی ہے۔ اور اسی خدا پرستانہ سعی اور تدبیر

پر رزق و معاش کی وسعت اور خوشحالی کا وعدہ ہے، انفرادی بھی اور اجتماعی بھی۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولو ان اھل القریٰ اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض ولکن کذبوا فاخذنٰھم بما کانوا یکسبون - اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیزگاری (اختیار) کرتے تو ہم (بجائے ارضی و سماوی آفات کے) ان پر آسمان اور زمین کی نعمتوں (کے دروازے) کھول دیتے (یعنی آسمان سے بارش اور زمین سے پیداوار ان کو کثرت کے ساتھ عطا فرماتے) لیکن انہوں نے (ایسا نہیں کیا) بلکہ جھٹلایا تو ہم نے ان کے کرتوتوں کی بدولت انہیں پکڑ لیا۔

مطلب یہ کہ اگر یہ لوگ کفر و تکذیب اور نافرمانی سے بچکر تقویٰ اور پرہیزگاری کی راہ اختیار کرتے تو ہم ان کو آسمانی اور زمینی نعمتوں سے مالامال کر کے معاشی وسعت اور خوشحالی سے ہمکنار کر دیتے۔ مگر انہوں نے راہ تکذیب اختیار کی تو وہ عذاب الٰہی میں گرفتار کر لئے گئے۔

معلوم ہوا کہ معاشی خوشحالی اور وسعت رزق میں طاعت الٰہی اور پرہیزگاری کے اختیار کرنے کو بھی بڑا دخل ہے۔ اسی طرح معاشی زندگی اور دنیوی نعمتوں سے محرومی میں بھی خدا تعالیٰ کی نافرمانی اثر انداز ہوتی ہے۔

خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے: وضرب اللہ مثلاً قریۃ کانت اٰمنۃ مطمئنۃ یاتیھا رزقھا رغدا من کل مکان فکفرت بانعم اللہ فاذاقھا اللہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون اور اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالت عجیبہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ بے خطرہ اور اطمینان میں تھے۔ (یعنی نہ تو ان کو باہر سے دشمن کا کھٹکا تھا نہ اندر سے کسی طرح کی فکر و تشویش تھی۔ خوب امن و چین سے زندگی گذرتی تھی۔) ان کے کھانے پینے کی چیزیں بڑی فراغت کے ساتھ ہر چہار طرف سے ان کے پاس پہنچا کرتی تھیں۔ (یعنی کھانے کیلئے غلے اور پھل وغیرہ کھنچے چلے آتے تھے۔ ہر چیز کی افراط تھی، گھر بیٹھے دنیا کی نعمتیں ملتی تھیں۔) سو (بجائے اس کے کہ اس حالت میں منعم حقیقی کا احسان مانتے اور اسکی اطاعت کرتے) انہوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی (یعنی خدا کے ساتھ شرک و کفر کیا) اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان حرکات کی بدولت ایک محیط قحط اور خوف کا مزا چکھایا۔ (کہ عام قحط میں ان کو مبتلا کر کے رزق طلبا اور فراخ روزی کی جگہ بھوک نے اور امن و چین کی جگہ خوف و ہراس نے ان کو اس طرح گھیر لیا جیسے کپڑا پہننے والے کے بدن کو گھیر لیتا ہے، ایک دم کیلئے بھوک اور ڈر ان سے جدا نہ ہوتا تھا۔)

۲۔ اس کے ساتھ ہی اس معاشی مصیبت کا دوسرا تدبیری حل یہ بتلایا گیا ہے کہ زندگی کے دوسرے

شعبوں کی طرح رزق و معاش کے معاملات میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم پر عمل کیا جائے، یعنی ان کے ذریعہ حصول رزق یا کسب معاش کے جو حلال اور پاکیزہ ذرائع تعلیم کئے گئے ہیں صرف ان کو ہی اختیار کیا جائے، اور ان جائز ذرائع سے جو کچھ ملے اس کو اللہ کی نعمت سمجھ کر اس پر شکر کے ساتھ قناعت کی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ "انسان کو آسودگی اس وقت نصیب ہو سکتی ہے جبکہ پیٹ و روٹی کے سوال کے ساتھ "قناعت" کا مسئلہ بھی سمجھایا جائے اور دنیا کو بتایا جائے کہ اس سوال کا اصل حل اپنے اندر قناعت کا جذبہ پیدا کرنا ہے اور یہ کہ کھانا زندگی کی بقا کیلئے ہے۔ زندگی کھانے کیلئے نہیں ہے اس لئے "پیٹ" کو اتنی اہمیت ہرگز نہیں دینی چاہیے جس سے دل کا سکون و اطمینان برباد ہو جائے اور دنیا کے امن و امان کی مٹی پلید ہو جائے۔ لالچ جب تک دور نہیں ہو جاتا اس وقت تک مال و دولت کی کثرت بھی کارگر نہیں ہوتی۔ حرص کی بیماری اگر باقی ہے تو پھر یہ انسان کو کسی کروٹ بھی چین لینے نہیں دے سکتی۔ حریص انسان سونا چاہے گا مگر اس کو اطمینان بھری نیند میسر نہیں آ سکتی۔ لالچی آدمی کھائے گا مگر اسے آسودگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ حرص و آز کا بندہ خزانہ گن گن کر رکھے گا مگر پھر بھی صبر و اعتماد نصیب نہ ہو گا۔

اسلام نے اسکی کوشش کی ہے کہ انسان قناعت سے کام لے، پیٹ کو اتنی اہمیت نہ دے کہ سارے فتنوں کا سرچشمہ ہی بن جائے، جبتک یہ دولت قناعت حاصل نہیں ہوتی، مادی دولت کے ذریعہ انسان کو افکار کے ہجوم سے نجات نہیں مل سکتی، اور نہ اس کو دل کا اطمینان و سکون میسر آسکتا ہے ۔۔۔ ضرورت ہے کہ اسلام کی اس تعلیم کو عالمگیر کیا جائے اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی تلقین کی جائے۔ کیونکہ آج سرمایہ داروں نے ضرورت سے زیادہ دولت کو اپنے پاس روک کر غریبوں کو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے، اور دنیا کے غریب و مزدور خونی انقلاب کی جدوجہد میں مصروف ہیں ۔۔۔ مالداروں اور سرمایہ داروں کی یہ ہوس کہ دنیا کی ساری دولت ہمارے گھروں میں آ جائے اور غریبوں کا یہ جذبہ کہ ان کا مطالبہ خوراک دن بدن بڑھتا ہی چلا جائے دونوں صورتیں حرص و لالچ کی پیداوار اور اسلام کی تعلیم قناعت کے خلاف ہیں۔

افراط و تفریط سے علیحدہ ہو کر جب تک انسان اعتدال کی راہ اختیار نہیں کرتا اور دولتمند و اور غریبوں سب میں اسلام کی تعلیم کردہ قناعت کے ذریعہ یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا کہ اپنی ہر ضرورت کو کم سے کم دولت میں پوری کرنے لگیں اور امیر و غریب ہر شخص اپنی اس خواہش کو ترک نہ کر دے

کہ دنیا کی ساری دولت سمٹ کر میرے ہی گھر آ جائے، اس وقت تک دنیا کا امن و امان اور سکون و اطمینان پلٹ نہیں سکتا۔

موجودہ دنیا کے اکثر و بیشتر فتنے اسی لئے برپا ہیں کہ انسانوں میں حرص و لالچ بڑھتا جا رہا ہے۔ اور دنیا کی دولت پر لوگ جان دینے لگے ہیں۔ مگر افسوس کوئی لیڈر نہیں جو اس مرض کا علاج کرے اور لوگوں کی ذہنی اصلاح کرے۔ ان کو قناعت کا سبق دے اور ان سے یہ کہے کہ آخر پیٹ ہی کا سوال اتنا اہم کیوں ہے، تم قناعت کی تعلیم کیوں نہیں حاصل کرتے۔

یہ بات اسی وقت کوئی شخص کہہ سکتا ہے جب ہم "معاشیات" میں بھی "مارکس" وغیرہ کے نظریات کو اپنانے کی بجائے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات و تعلیمات کی فرمانبرداری اور اطاعت کو اپنا شعار بنا لینے پر آمادہ اور تیار ہو جائیں۔

آجکل معاشی مسئلہ کے حل کرنے کیلئے معاشی اونچ نیچ کے مٹانے، اور معاشی مساوات کے نئے نعرے جس طرح سامنے آ رہے ہیں، انہوں نے بجائے اصلاح احوال کے خود ایک فتنہ کی شکل اختیار کر لی ہے، حالانکہ اس عدم مساوات اور نابرابری کا مٹا دینا نہ صرف یہ کہ تکوینی مصالح اور تمدنی ضروریات کو نظر انداز کرنا۔ اور اس وجہ سے ناقابلِ عمل اور غیر ممکن ہے۔ بلکہ اسلامی معاشیات اور خدائی معیشت کے بھی بالکل خلاف ہے کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند۔

ایک شبہ کا ازالہ | بعض لوگوں کو اسلام کے اس اصول سے کہ اس نے حق معیشت میں سب کو برابر رکھا ہے، یہ شبہ ہو گیا کہ اسلام نے بھی معاشی مساوات کو تسلیم کر لیا ہے، اس شبہ کے ازالہ کیلئے مناسب معلوم ہوا کہ مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی مرحوم کی تصنیف "اسلام کا اقتصادی نظام" کے چند ضروری اقتباسات پیش کر دئے جائیں:

مولانا فرماتے ہیں: "اسلام اس فطری نظام کا حامی ہے جو نہ ایسی مساوات کو تسلیم کرتا ہے۔ جس میں تمام انسان بغیر کسی فرق کے اپنی معاشی زندگی میں بالکل مساوی ہوں اور ان کے درمیان مالی درجات کا ادنیٰ سا بھی تفاوت نہ پایا جاتا ہو، اور نہ ایسے ظالمانہ تفاوت کا قائل ہے جس میں غربت و امارت کا امتیاز اس طرح قائم ہو جائے کہ غریب نانِ شبینہ کو محتاج رہے اور امیر دولت قارون کا مالک بن جائے۔ ص ۵۹"

درجات معیشت | اور فرماتے ہیں: "اگرچہ حق معیشت میں سب مساوی ہیں، لیکن درجاتِ معیشت میں مساوی نہیں ہیں، اور معیشت میں درجات کا تفاوت ایک حد تک

نظری ہے۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ سب کیلئے سامانِ معیشت ایک ہی طرح کا ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ ہو سب کیلئے مگر درجات کا یہ تفاوت ایسے اعتدال پر قائم رہے کہ کسی حال میں بھی وہ لوگوں کے درمیان وجہ ظلم نہ بن سکے۔ یعنی تفاوتِ درجات تو ہو لیکن نہ ایسا کہ "معیشت" انسانوں کو دو طبقوں میں اس طرح تقسیم کردے کہ ایک کی ترقی دوسروں کے فقر و افلاس کا سبب بنے اور دوسرا پہلے کے معاشی اغراض کا آلہ کار بن کر رہ جائے" صلا

اور لکھتے ہیں: "اسلامی حقِ معیشت کی مساوات کو تو تسلیم کرتا بلکہ ضروری قرار دیتا ہے۔ لیکن مدارجِ معیشت میں مساوات کا قائل نہیں ہے۔ یعنی وہ اسکو نہیں مانتا کہ یہ ضروری ہے کہ سب کو ایک ہی طرح ہر سامانِ معیشت حاصل ہو، لیکن یہ ضروری سمجھتا ہے کہ سب کے لئے اور جد و جہد اور ترقی کی راہیں یکساں طور پر سب کے سامنے کھل جائیں۔ اس کے برعکس سوشلزم حقِ معیشت کی مساوات کے ساتھ نفسِ معیشت کی بھی مساوات کا قائل ہے، اور مدارجِ معیشت کا قطعاً انکار کرتا ہے۔" صلا

اور فرماتے ہیں: "اسلام نے حقِ معیشت کی مساوات کو تسلیم کیا اور سعی و ترقی کی راہیں سب کیلئے یکساں طور پر کھلی رکھیں۔" صلا

ان اقتباسات سے یہ واضح ہو کہ مذکورہ شبہ بالکلیہ زائل ہو جاتا ہے کہ اسلام نے جس "حقِ معیشت" میں برابری اور مساوات تسلیم کی ہے۔ اس سے مراد "معاشی مساوات" یا معیشت میں برابری نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ سعی اور ترقی کی راہیں سب کے لئے یکساں طور پر کھلی رہیں، اور ہر شخص کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ ذرائع آمدنی کو استعمال کرکے اپنی معیشت میں ترقی کر سکے، نہ تو سرمایہ دارانہ نظام کی طرح سعی اور ترقی کی راہوں کو کسی خاص طبقہ کے اندر مخصوص اور منحصر کرکے دوسرے طبقات کو معیشت میں ترقی کرنے اور بڑھنے سے روکا جائے، اور نہ ہی اشتراکی نظام کی طرح دوسروں کی سعی اور محنت سے حاصل شدہ مال و دولت کو حکومت کی ملکیت یا ذرائع آمدنی پر حکومت کا حق قرار دیا جائے۔ اس لئے کہ اس کا نتیجہ بھی افرادِ ملک کے حق میں یہی نکلتا ہے کہ ان کو معیشت میں ترقی کرنے اور بڑھنے سے روک دیا گیا ہے۔ اور ترقی کی راہوں کو ان کے لئے مسدود کر دیا گیا۔ اور اسطرح گویا ان کو اس حقِ معیشت سے محروم کر دیا گیا جس میں اسلام نے تمام باشندگانِ ملک کے لئے افراد ہوں یا حکومت، مساوات اور برابری تسلیم کی ہے۔

دوسری بات ان اقتباسات سے یہ واضح ہو رہی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح "سوشلزم"

بھی اسلامی معاشیات کے مخالف اور اس کے برعکس ہے۔

آگے چل کر مولانا نے سوشلزم کے بنیادی اصولوں، انفرادی ملکیت کی نفی اور بلحاظ معیشت مساوات کے اصل محرکات کی نشاندہی کرتے ہوئے بڑی وضاحت اور صفائی کے ساتھ بتلایا ہے کہ ان اصولوں کی بنیاد مذہبی گروہ کے مقابلہ میں صرف انتقامانہ جذبات پر رکھی گئی ہے اور عملی تجربہ نیز عقلی دلائل کی رو سے یہ ہر دو اصول غلط راہ حق سے منحرف اور اعتدال کے بالکل خلاف ہیں۔

مولانا کی عبارت یہ ہے: ان تفصیلات کے ساتھ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سوشلزم کے مسطورہ بالا ہر دو اصول دراصل اس نظام اور سوسائٹی بلکہ اس مذہبی گروہ کے مقابلہ میں انتقامانہ جذبات کے تحت اصول قرار پائے ہیں، جس کے ظالمانہ اصول سے متاثر ہو کر کارل مارکس اور انگلز نے اپنے نظریوں اور ان کے ماتحت عملی سرگرمیوں کا اختراع کیا، ورنہ یہ ہر دو اصول نہ عملی تجربہ کی خراد پر ٹھیک اترتے ہیں۔ اور نہ عقلی دلائل کی روشنی میں صحیح نظر آتے ہیں۔ اور اس لئے راہِ حق کے قطعاً خلاف اور اعتدال کے منافی ہیں۔ ص ۳۹۲

سرمایہ داری نظام کے ظالمانہ ماحول سے متاثر ہو کر جن لوگوں نے یہ انتقامی اصول مقرر کئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان اصولوں کے ذریعہ معاشرہ کی اصلاح کے خواہاں نہیں تھے۔ بلکہ وہ اس طرح صرف سرمایہ داروں سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ اگر وہ معاشرہ کی اصلاح کے خواہاں ہوتے تو وہ ایسے اصولوں کا اختراع کیوں کرتے جو محض انتقامی اور جذباتی ہیں، نہ تو عقلی دلائل کی روشنی میں صحیح ہیں، اور نہ ہی عملی تجربہ کی خراد پر ٹھیک اترتے ہیں۔ کیا ایسے جذباتی ناقابلِ عمل اصولوں کے ذریعہ معاشرہ کی اصلاح ہو سکتی ہے۔؟

معاشی نظام کے فساد کا سبب سرمایہ داری نظام کے فساد کا اصل سبب انفرادی ملکیت نہیں ہے جس کی اصلاح سوشلزم کے اصول نفی ملکیت کے ذریعہ کی جا سکے۔ بلکہ اس فساد کا باعث اس حق ملکیت کا آزادانہ اور مطلق العنانہ غیر معتدل استعمال ہے۔ جیسا کہ مولانا نے بھی لکھا ہے: اسلام کی نظر میں زمین یا ذرائع پیداوار کا انفرادی ملکیت ہونا دراصل معاشی نظام کے فساد کا باعث نہیں ہے بلکہ اس میں اعتدال و توازن کا فقدان راہِ فساد کھولتا ہے۔ ص ۴۲۵

اور اس کا علاج یہ نہیں کہ انفرادی ملکیت کی ہی نفی کر دی جائے جیسا کہ سوشلزم نے یہ علاج تجویز کیا ہے بلکہ اس کا صحیح اسلامی علاج یہ ہے کہ ذرائع پیداوار اور حق معیشت میں مساوات تسلیم

کی جائے اور سعی وترقی کی راہیں ہر فرد اور ہر طبقہ کے لئے کھلی رکھی جائیں اور حق ملکیت کے حاصل کرنے کیلئے پابندیاں اور حاصل شدہ ملکیت پر حقوق و فرائض عائد کرکے ناجائز اکتناز و احتکار کی راہوں کو مسدود کر دیا جائے اور ان طریقوں پر پہرے بٹھلا دئیے جائیں جن کے ذریعہ ناجائز مال و دولت کا اکتساب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے تحریر فرمایا ہے: "اس نے (اسلام نے) قانون سازی کے ذریعہ زکوٰۃ اور وراثت اور بعض تجارتی اصول کو لازم قرار دے کر اور سود اور قمار (جوے) اور اسی قسم کے تمام کاروبار کو ناجائز بتا کر اکتناز و احتکار کو فنا کر دیا اور تمام ایسی معتدل راہوں کا سدباب کر دیا جو ظالمانہ سرمایہ داری کا موجب بنتی ہیں۔ صـ ۳۹۱

معلوم ہوا کہ سوشلزم نے معاشی نظام کے فساد کا جو سبب، انفرادی ملکیت کو تبلایا ہے۔ اور اسی طرح اس کا جو علاج انفرادی ملکیت کی نفی سے تجویز کیا ہے یہ دونوں باتیں غلط اور غیر واقعی ہیں۔ سوشلزم نہ تو سرمایہ داری نظام کے فساد کے اصل سبب کی صحیح تشخیص کر سکا اور نہ ہی اس نے اس فساد کا صحیح علاج تجویز کیا۔ اس بنیادی اور اصولی اختلاف بلکہ تضاد کے ہوتے ہوئے جو لوگ اسلامی معاشیات اور سوشلزم کے درمیان مصالحت یا اتحاد کیلئے کوشاں ہیں اور وہ دونوں کا ایک ہی مقصد تبلاتے ہیں۔ ان کو اس اصولی اختلاف کی روشنی میں اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ سوشلزم کا اصلاح معاشرہ یا مساوات بظاہر ایک خوشنما اور دلفریب دعویٰ ہے مگر درحقیقت یہ ایک ناقابل فہم اور غیر ممکن العمل محض جذباتی اور انتقامی نعرہ ہے، جو کسی گہرے غور و فکر اور سوچ و تدبیر کا نتیجہ نہیں بلکہ محض انتقامی جذبہ اور خالص اشتعال انگیزی کی پیداوار ہے۔

اسلامی معاشیات میں جبری تقسیم دولت کی ضرورت ہی نہیں۔ جب اسلام کی تعلیم کا یہ بنیادی اصول مسلمان کے پیش نظر ہوگا کہ دنیا اور اسکی ہر چیز فانی اور عارضی ہے۔ اس لئے معاد یعنی آخرت کے مقابلہ میں معاش اور دنیوی مال و متاع کی قدر و قیمت اس کی نظر میں ہیچ در ہیچ ہے تو پھر اس کے لئے کسب مال کے جائز ذرائع میں اپنی سعی و ترقی کو محدود رکھنا اور اسلامی حدود اور پابندیوں پر عمل کرنا دشوار نہیں رہے گا، اور جس قدر مال ان جائز ذرائع سے حاصل ہوگا، اس میں اسلام کے عائد کردہ لازمی اور غیر لازمی حقوق و فرائض، زکوٰۃ و عشر، نفلی صدقات، وقف، وصیت، قرض حسنہ وغیرہ کے ذریعہ حاجتمندوں کی ضرورتوں کے پورا کرتے رہنے سے بھی اس کا دل تنگ نہیں ہوگا بلکہ فراخدلی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مال کے خرچ کرنے کو اپنے لئے سعادت ابدی سمجھتے ہوئے اس کے لئے برضا و رغبت بروقت تیار رہے گا۔

اب غور فرمایا جائے کہ جس اسلامی معاشی نظام میں حاجتمندوں اور حقداروں پر طرح طرح سے

خرچ کرنے کی اتنی تاکید و ترغیب ہو کہ معاشیات کسب کی بجائے اگر اسکو معاشیات انفاق کا نام دیدیا جائے تو بجا ہے۔ اس میں غیر اسلامی نظام معاش کی طرح مال و دولت کی جبری اور غیر اختیاری تقسیم کی ضرورت ہی کتنی رہ جاتی ہے۔

جبری تقسیم کا نتیجہ بلکہ اسلام کے اس اخلاقی اور روحانی اصول کی تعلیم و تبلیغ اور لوگوں کے دلوں میں دنیا کی حقارت دبے وقعتی کے پیدا کئے بغیر حکومت اور قانون کے جبر و زور کے ذریعہ تقسیم دولت سے تو لوگوں میں انفاق و عطا کی جگہ کسب و حرص مال کا مرض اور زور پکڑتا ہے، جس کا روز افزوں تماشا ہم خود پاکستان میں بھی دیکھتے رہتے ہیں۔ کہ جتنی زیادہ سرمایہ داروں، کارخانہ داروں وغیرہ کے منافع قانون و حکومت کے زور و جبر سے مزدوروں اور غریبوں تک پہنچانے کے لئے کوشش کی جاتی ہے اتنی ہی زیادہ نہ صرف یہ کہ رشوت ستانی اور چور بازاری ہی کی گرم بازاری بڑھتی جاتی ہے بلکہ طرح طرح کی چالاکیوں اور ہوشیاریوں سے نفع باز اپنے مزدوروں اور غریبوں ہی کو ذبح اور تنگ کرتے رہتے ہیں۔ مگر نفع بازی سے باز نہیں آتے اور ان جبری قوانین سے ان کی ہوس نفع بازی میں کچھ کمی نہیں آتی۔

اسلامی حکومت کے کرنے کا کام اس لئے اسلام کی دینی حکومتوں کا اصل کام تقسیم دولت کے لئے قدم قدم پر جبر و تشدد نہیں بلکہ شہریوں میں خدا تعالیٰ اور معاد، یعنی آخرت کے ایمان و یقین پر مبنی انفاقی ذہنیت کو پیدا کرنے اور اسکو ترقی دیتے رہنا ہے۔ ساتھ ہی ناجائز ذرائع آمدنی پر مضبوط کنٹرول کر کے، شراب خانوں، چکلوں، سینما گھروں وغیرہ گوناگوں بد معاشیوں اور فضول خرچیوں کے اڈوں کو بند کرنا ہے جو غیر اسلامی حکومتوں نے فواحش و منکرات کی گرم بازاری کی راہوں سے اپنی آمدنیاں بڑھانے کے لئے قائم کئے ہوئے ہیں۔

غرضیکہ اسلام میں معاشی مسئلہ ایک جزوی اور ثانوی حیثیت کا درجہ رکھتا ہے۔ اور معاد کے بالکلیہ تابع ہے۔ اس کو ایسی حیثیت اور اہمیت کا مقام حاصل نہیں ہے کہ تمام دنیوی زندگی کے کاروبار کا اسکو محور بنالیا جائے اور مقصد زندگی اسی کو قرار دیدیا جائے۔ بلکہ اس عارضی اور فانی زندگی کے گذارنے اور بسر کرنے کیلئے عارضی اور فانی اسباب کے درجہ کی ایک گھٹیا اور حقیر چیز ہے۔

اسلام کی نگاہ میں اصل مسئلہ معاد اور عالم آخرت کا ہے۔ کیونکہ وہاں کی زندگی باقی اور ابدی ہے اور اسی کے لئے سامان مہیا کرنے کے واسطے انسان کو اس سرائے فانی میں بھیجا گیا ہے۔ اس لئے اسلام میں دنیوی معاش کا مسئلہ سفر اور راہ کا مسئلہ ہے۔ منزل اور قرار گاہ کا مسئلہ نہیں ہے۔

اب سفر اور راہ کو ہی منزل اور مقصد سمجھ لینا اور اپنی تمام قوتوں اور توانائیوں کو اسی پر خرچ کر ڈالنا، اور اصل قرارگاہ سے بے فکری اور بے توجہی برتنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

اسی وجہ سے اسلام میں معاشی مسئلہ کو معادی مسئلہ کے تابع قرار دیا گیا ہے۔ اور خوف خدا اور آخرت کی دار وگیر اور حساب وکتاب کے فکر سے اس کا حل کیا گیا ہے۔ جب فکر آخرت اور اس کا محاسبہ پیش نظر ہوگا تو دنیا کے مال ومتاع کے ساتھ اس قدر شغف و انہماک نہیں رہے گا جس کی وجہ سے انسان دنیا کی دولت کا حریص اور طالب ہو کر اس کے اکتساب و استحصال میں حرام وحلال، جائز و ناجائز کی حدود کو قائم نہیں رکھتا ــــ فکر آخرت سے انسان میں قناعت اور تھوڑے پر اکتفا کرنے کی خصلت پیدا ہو کر حرص دنیا کے مذموم رذیلہ کی اصلاح ہو جاتی ہے۔

یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنی معاش کے لئے جد وجہد اور سعی ومحنت کو چھوڑ دے، اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے بلکہ منشا یہ ہے کہ طلب معاش کی اس سعی ومحنت میں خدا تعالیٰ کی رزاقی ضمانت پر پورا بھروسہ اور کامل اعتماد ہو، اور جو کچھ مل جائے اس پر قناعت کرے، اس فکر میں نہ گھلتا رہے کہ ہمارے پاس لاکھوں کی جائداد کیوں نہ ہوئی، یا دولت کمانے میں اس طرح مشغول نہ ہو جائے کہ جائز وناجائز کی ساری بحث سے قطع نظر کرے اور ظلم وجور اور تعدی کو اپنا پیشہ بنائے۔

دنیا میں جبتک اسلام کے قانون قناعت کی اشاعت نہیں ہوتی، اور دنیا اس پر عمل نہیں کرتی معاشی مشکلات سے نجات نہیں مل سکتی۔ اس معاشی مسئلہ کا حل صرف قانون قناعت سے ہی ہو سکتا ہے۔

اور یہ قانون فلک ہیں اس وقت تک عام نہیں ہو سکتا اور دنیا اسکو قبول کر کے اس پر عمل نہیں کر سکتی جبتک دنیا کے صدر جمہوریہ، صدر مملکت وزراء اعظم اور دوسرے سربرآوردہ قومی رہنما اپنی فضول خرچیوں عیش پرستیوں کو ترک کر کے قناعت پر عمل نہیں کرتے ــــ اب آخریں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنا خوف، آخرت کی فکر اور قناعت کی دولت سے بہرور اور مالامال فرمائے۔ آمین۔ ■■

۳۲۔ فرمایا : خود مکان بنانا مذموم نہیں بلکہ وہ تو اگر بقید ضرورت ہو تو محمود ہے۔ ہاں بناء الفاسد علی الفاسد نہ ہو، وجہ یہ ہے کہ بغیر مکان کے گزر نہیں ہو سکتا اور سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ جب مکہ تشریف لے گئے تو فاقوں کو تو جھیل لیا مگر مکان کی تکلیف نہ برداشت فرما سکے۔ دعا کی کہ اے اللہ اپنے بیٹھنے کی جگہ مرحمت فرمایئے کہ جس سے کوئی اٹھا نہ سکے، ایک روز مطاف میں تشریف رکھتے ہوئے ذکر میں مشغول تھے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تشریف لائے اور کچھ پیسے ہاتھ پر رکھے، اور فرمایا تمہارے ہاتھوں لاکھوں کا خرچ رکھا گیا ہے۔ حضرت نے عرض کیا کہ میں اس کا متحمل نہیں، البتہ ایک ایسا گھر چاہیئے۔ فرمایا یہ بھی ہو جاویگا جس کا غیب سے یہ سامان ہوا کہ ایک شخص نے حضرتؒ کے نام مکان خرید دیا۔ حضرتؒ نے اس مکان میں بیٹھتے ہی معاً وقف نامہ لکھا کہ حیات تک رہوں گا۔ میرے بعد یہ مکان اغراض محمودہ کیلئے وقف ہے اور اس طرح سے شرط لگانا وقف میں جائز ہے کہ اپنے انتفاع کی یا اپنی اولاد کے یا اولاد کی اولاد کے انتفاع کی شرط لگائے۔ یہ بھی ثواب کا مرتبہ ہے۔ مگر میں اس کا مشورہ کسی کو نہیں دیتا، کیونکہ بعض دفعہ وقف کرنے کے بعد اولاد کو کوئی ایسی تکلیف ہوتی ہے۔ مثلاً کسی وقت وہ محلہ ویران اور خطرناک ہو گیا یا ہمسائے شریر ہو گئے۔ اب مکان بدلنے کی ضرورت

ہوتی ہے، مگر وقف کی وجہ سے اسکو بیع نہیں کر سکتے۔ آگے ہر شخص اپنی مصلحت سمجھ سکتا ہے۔ (تاسیس البنیان علی تقوی من اللہ ورضوان صـ۲۷)

۳۳۔ فرمایا: دو دل یک شود بشکند کوہ را۔ ہمارے حاجی صاحبؒ رات کو تہجد میں اکثر سورہ یٰسین پڑھا کرتے تھے، اور اسکی حکمت میں یہ شعر پڑھتے تھے کہ جب دو دل مل جائیں تو پہاڑ کو بھی توڑ دیتے ہیں اور یہاں تین دل ایک ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سے کہ ایک مصلّی کا دل، دوسرا قلب اللیل، تیسرا قلب القرآن یعنی یٰسین جسکو حدیث میں قلب القرآن فرمایا ہے، تو تین دل مجتمع ہو کر شیطان کو کیسے نہ بھگا دیں گے۔ (الرحیل الی الخلیل صـ۵۲)

۳۴۔ فرمایا: جو مصلحت (جنت سے نکلنے میں) حضرت آدم علیہ السلام کے حق میں تھی اسکو حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا ہے کہ عارفوں کے لئے بڑی نعمت معرفت ہے، اور معرفت کی دو قسمیں ہیں، ایک علمی اور ایک عینی۔ معرفت علمی تو یہ ہے کہ صفات کمال اور اس کے آثار کا علم ہو جائے۔ اور معرفت عینی یہ ہے کہ اس صفت کے اثر کا مشاہدہ ہو جائے، تو اس وقت حضرت آدم علیہ السلام کو معرفت علمی تو حاصل تھی، لیکن معرفت عینی صرف بعض صفات کی حاصل تھی، جیسے منعم کہ اس صفت کا اس وقت مشاہدہ ہو رہا تھا، لیکن بعض صفات کا مشاہدہ اس وقت نہ تھا۔ مثلاً توّاب کہ اس صفت کی معرفت علمی تو حاصل تھی۔ باقی معرفت عینی حاصل نہ تھی، اور معرفت عینی افضل ہے معرفت علمی سے۔ تو جنت سے علیحدہ کر کے خدا تعالیٰ کو حضرت آدم علیہ السلام کی تکمیل عرفان مقصود تھی۔ پس یہ اخراج حقیقت میں عقوبت نہ تھی، بلکہ تکمیل تھی اور بعض قرائن سے حضرت آدم علیہ السلام کو اس کا کچھ پتہ چل گیا تھا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب آدم علیہ السلام کی ناک میں روح داخل ہوئی تو آپ کو چھینک آئی۔ ارشاد ہوا کہو الحمد للہ۔ اور فرشتوں کو حکم ہوا کہو یرحمک اللہ۔ تو بعض روایات میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام روئے کہ دعائے رحمت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی لغزش ضرور ہوگی۔ اور توبہ کے بعد رحمت ہوگی، اور اس کمال معرفت کی مصلحت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔ اتنا بخار چڑھتا تھا جتنا دو آدمیوں کو چڑھتا ہے۔ کیونکہ جس اسم کا یہ مظہر ہے اسکی معرفت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علیٰ وجہ الکمال عطا فرمائی تھی۔ غرض حضرت آدم علیہ السلام کا جنت سے آنا بھی رحمت ہے۔ (المورد الفرسخی فی المورد البرزخی صـ۱۰۱، النور صـ۲۲)

۳۵۔ فرمایا: کہ حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ اگر ایک لطیفہ بھی منوّر ہو جائے تو اسکے

ذریعہ سے سب منور ہو جاتے ہیں۔ حضرت کے یہاں زیادہ اہتمام قلب کا تھا، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ۔ (ارواح ثلاثہ صد ۳۳۰، اشرف السوانح صہ ۱/۳۸) یعنی جسم میں ایک لوتھڑا ایسا ہے جب وہ ٹھیک رہتا ہے سارا بدن ٹھیک رہتا ہے۔ اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ جان لو کہ وہ دل ہے۔

۳۷۔ فرمایا: حضرت حاجی صاحبؒ کے سامنے آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ۔ (یعنی میں نے جن و انسان کو اسی واسطے پیدا کیا کہ میری عبادت کیا کریں) کے متعلق سوال کیا گیا کہ اس میں جن و انس کی تخصیص کی کیا وجہ ہے۔ خدا تعالیٰ کی عبادت تو ساری مخلوق ہی کرتی ہے۔ اس میں کچھ جن و انس کی تخصیص نہیں۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ایک تو عبادت ہے اور ایک طاعت ہے اوّل ایک مثال سے ان دونوں میں فرق سمجھ لو۔ وہ یہ کہ ایک تو نوکر ہے اور ایک غلام ہے۔ نوکر کا کام تو معین ہوتا ہے، خواہ ایک یا متعدد مثلاً باورچی ہے کہ اس کے لئے کھانے پکانے کی خدمت معین ہے، یا سپاہی ہے یا مکان پہ بازار اور گھر کے کام کرنے کے واسطے کوئی نوکر ہے تو جس خدمت کے واسطے یہ لوگ نوکر ہیں۔ ان سے وہی خدمت لی جا سکتی ہے، خود آقا بھی اس کا لحاظ رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر آقا باورچی سے کہے کہ یہ خط لے کر گنگوہ جاؤ تو نوکر ضابطہ میں انکار کر سکتا ہے۔ اور غلام کی کوئی خدمت معین نہیں ہے بلکہ تمام خدمات اسکے ذمہ ہیں جسکا بھی حکم ہو جائے۔ چنانچہ ایک وقت اسکو آقا کا پاخانہ بھی اٹھانا پڑتا ہے اور ایک وقت میں آقا کی پوشاک پہن کر آقا کا قائم مقام اور نائب بنکر جلسہ یا دربار میں جانا پڑتا ہے۔ غرض یہ کہ غلام کو کسی وقت بھی کسی خدمت سے انکار نہ ہوگا۔ اسی طرح جن و انس کے سوا تمام مخلوق کی طاعت معین ہے۔ ہر شے مخلوقات میں سے ایک خاص کام پر معین ہے کہ اس کے سوا دوسرا کام اس سے نہیں لیا جا سکتا۔ مگر انسان کی کوئی خدمت معین نہیں، چنانچہ ایک وقت میں انسان کا سونا عبادت ہے، ایک وقت میں پاخانہ پھرنا عبادت ہے، مثلاً جماعت تیار ہو اور پیشاب پاخانہ کا زور ہو تو اس وقت پیشاب پاخانہ سے فراغت حاصل کرنا واجب ہے اور نماز پڑھنا اس وقت حرام ہے۔ اگر پیشاب پاخانہ سے فراغت حاصل نہ کی تو حرام فعل کا مرتکب ہوا۔ اس وقت اس کا بیت الخلاء میں جانا عبادت ہے۔ ایک وقت تو انسان کی یہ حالت ہے اور ایک وقت انسان کی یہ شان ہے کہ مظہر حق بنا ہوا ہے۔ اس وقت اسکی زبان سے مردہ دل زندہ ہوتے ہیں۔ غرض جو شان غلام کی ہے وہی انسان کی ہے۔ عبد شدن (غلام ہونا) کیلئے انسان ہی ہے۔ باقی تمام مخلوق ذاکر شاغل ہے۔

مگر عابد صرف انسان ہی ہے۔ یہ کسی خاص حالت اور خاص کام کو اپنے لئے تجویز نہیں کر سکتا۔ بلکہ حضرت حق جس حالت میں رکھیں۔ اسی میں اسکو رہنا چاہیئے۔ (سلوۃ الحزین صہ۱۵، الرحیل الی الخلیل صہ۱۴، تفاضل الاعمال صہ۱)

۳۶۔ فرمایا: کہ ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ نے حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ سے عرض کیا کہ حضرت صاحب میں ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا مولوی صاحب ابھی تو پوچھ رہے ہو، پوچھنا دلیل تردد کی ہے۔ اور تردد دلیل خامی کی ہے۔ خامی میں نوکری چھوڑنا مناسب نہیں۔ (کمالات اشرفیہ صہ۳۸) ملفوظ ہذا سے حضرت حاجی صاحبؒ کی کمال تحقیق مناسب حال ظاہر ہے۔

۳۷۔ فرمایا: کہ الحزم سوء الظن کی تفسیر میں حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ مسہ بنفسہ۔ یعنی دانائی اور احتیاط یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس سے سوءظن ہی رکھے۔ کسی وقت مطمئن نہ ہو، ہمیشہ کھٹکتا رہے۔ اگرچہ حکماء نے اس جملہ کے دوسرے معنی بھی لئے ہیں۔ وہ یہ کہ انسان کو کسی پر اعتماد نہ چاہیئے ہر شخص پر بدگمان رہے۔ احتیاط رکھے، وہ کیسا ہی مخلص دوست ہو معاملہ کے اعتبار سے یہ بھی صحیح ہے۔ مگر عارفین یہ کہتے ہیں، کہ دوسروں سے تو حسن ظن رکھے اور اپنے نفس سے سوءظن رکھے (ملفوظات کمالات اشرفیہ صہ۱۱۴)

۳۸۔ فرمایا: میں اہل طریق کیلئے ہمیشہ اسکا خیال رکھتا ہوں کہ ہر کام سہولت سے ہو جائے۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے مقاصد سہولت سے حاصل ہو جاتے ہیں اور یہ موقوف ہے صحبت پر۔ مرید کو شیخ کی خدمت میں ایک خاص مدت تک رہنا ضروری ہے۔ اس سے مقصود میں خاص سہولت ہو جاتی ہے۔ رہا یہ کہ کس قدر مدت میں کام ہو جاتا ہے۔ اس کا تعین مشکل ہے۔ یہ مناسبت پر موقوف ہے۔ اگر اہل استعداد ہوتا ہے تو بہت جلد کام ہو جاتا ہے۔ حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حضرت مولانا گنگوہیؒ کل بیتالیس روز رہے۔ اس کے بعد حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ ہم دے چکے جو کچھ دینا تھا۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ اس وقت کا یہ فرمانا حضرت کا کہ ہم دے چکے جو کچھ دینا تھا، سمجھ میں نہ آیا کہ کیا دیا۔ مگر پندرہ برس کے بعد معلوم ہوا کہ یہ دیا تھا۔ اس پر مولانا گنگوہیؒ نے مزاحاً فرمایا کہ اگر ہم جانتے کہ یہ چیز ہے تو اتنی محنت کیوں کرتے۔ اس پر حضرت مولانا تھانویؒ نے مزاحاً فرمایا کہ مل جانے پر فرماتے تھے ورنہ پندرہ برس تو معلوم ہی ہونے میں لگ گئے۔

(ملفوظات کمالات اشرفیہ صہ۲۵۹)

۳۹۔ فرمایا: یہ چشتیت اور نقشبندیت محض الوان طریق کا نام ہے کہ چشتیہ کا لون یہ ہے وہ اول تخلیہ کرتے ہیں پھر تحلیہ اور نقشبندیہ کا لون یہ ہے کہ اول تحلیہ کرتے ہیں، پھر تخلیہ اور یہ بھی متقدمین کا مذاق تھا۔ اب تو دونوں طریق کے محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ تخلیہ اور تحلیہ ساتھ ساتھ کرنا چاہیئے۔ اب ہر محقق چشتی بھی ہے اور نقشبندی بھی لیکن یہ فرق ضرور ہے کہ باوجود دونوں کو جمع کرنے کے چشتیہ تخلیہ کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور نقشبندیہ تحلیہ کا۔ اور اس فرق مذاق کی وجہ سے پہلے یہ قاعدہ تھا کہ جس طالب کو جس لون سے مناسبت ہوتی تھی مشائخ اسکو ایک دوسرے کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ نقشبندیہ بعض مریدوں کو چشتیہ کے یہاں بھیج دیتے اور چشتیہ بعض طالبوں کو نقشبندیہ کے ہاں بھیج دیتے، لیکن آج کل تو ہڑبونگ ہو رہا ہے کہ اکثر مشائخ سب کو ایک ہی طرف کھینچنا چاہتے ہیں۔ باقی جو محقق ہیں وہ اب بھی طالب کو اسکی مناسبت کے موافق مشورہ دیتے ہیں۔ چنانچہ مولوی محمد منیر صاحب نانوتویؒ نے حضرت حاجی صاحبؒ سے پوچھا کہ حضرت میرے لئے خاندان چشتیہ میں بیعت ہونا مناسب ہے یا نقشبندیہ میں حضرتؒ نے فرمایا کہ پہلے تم ہمارے ایک سوال کا جواب دو پھر بتلائیں گے۔ ایک شخص زمین میں جسکے اندر جھاڑ جھنکار کثرت سے ہیں تخم پاشی کرنا چاہتا ہے، تو بتلاؤ تمہاری رائے میں اسکو پہلے جھاڑ جھنکار صاف کرکے بعد میں تخم پاشی کرنا چاہیے یا اول تخم پاشی کردے پھر رفتہ رفتہ جھاڑوں کو بھی صاف کرتا رہے۔ مولوی صاحب نے کہا میرے نزدیک تو اسے اول تخم پاشی کر دینا چاہیئے تاکہ کچھ تو ثمرہ حاصل ہو جائے۔ ایسا نہ ہو کہ جھاڑوں کے صاف کرنے ہی میں عمر ختم ہو جائے۔ حضرت نے فرمایا بس تم نقشبندیہ سلسلہ میں بیعت ہو جاؤ۔ تم کو انہی کے مذاق سے مناسبت ہے۔ سبحان اللہ حضرت نے دقیق مذاق کو کتنی سہل مثال سے حل فرما دیا۔ (چشتیہ اور نقشبندیہ کا فرق سمجھا دیا۔) پھر طالب کے مذاق کی کیسی رعایت فرمائی کہ صاف کہہ دیا تم نقشبندیہ میں بیعت ہو جاؤ۔ یہ نہیں کہ سب کو اپنے ہی یہاں بھرتی کرنے کی فکر کریں جیسا آج کل اکثر ہو رہا ہے۔ (الرحیل الی الخلیل صلا، زکوٰۃ النفس ص۳۲)

۴۰۔ فرمایا: ہمارے حاجی صاحبؒ کو جو کوئی مشورہ دیتا تو ہر شخص کے مشورہ پر فرما دیتے، اچھا جیسی مرضی چاہیے وہ حضرت کی رائے کے موافق ہوتا یا خلاف۔ کسی کی دل شکنی نہ فرماتے تھے۔ ہر ایک کے جواب میں جیسی مرضی ہی فرماتے تھے۔ (تکمیل الانعام فی صورۃ ذبح الانعام ص۲)

۴۱۔ فرمایا: حضرت حاجی صاحبؒ سے ایک بی بی نے عرض کیا کہ میں اپنی جائداد وقف کرنا چاہتی ہوں۔ حضرتؒ نے فرمایا نہیں نہیں ایسا نہ کرو، کچھ اپنے لئے رکھ لو۔ نفس کو کبھی پریشانی ہو

جایا کرتی ہے ۔ پھر وہ پریشانی دین تک مفضی ہو جاتی ہے ۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ وہ زمانہ گیا کہ درہم و دینار رکھنا تقویٰ کے خلاف تھا ۔ اب تو اگر کسی کے پاس کچھ مال ہو تو اسکی حفاظت کرنا چاہئے ۔ کم ہمت انسان جب مفلس ہو جاتا ہے تو اول اس کا دین برباد ہوتا ہے ۔ (الاستغفار صنہ)

۴۲ ۔ حضرت علیؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ شادی کیسی ہے ۔ فرمایا سُرُوْرُ شَہْرٍ ایک ماہ کی خوشی ہے ، سائل نے کہا ثُمَّ مَاذَا ۔ پھر کیا ہوتا ہے ۔ فرمایا : لُزُوْمُ مَہْرٍ ۔ مہر کا لازم ہونا ۔ اس نے پوچھا ثُمَّ مَاذَا ۔ فرمایا ۔ کَسُوْرُ ظَہْرٍ ۔ کمر کا ٹوٹنا ۔ اس نے کہا ثُمَّ مَاذَا ۔ پھر کیا فرمایا : غُمُوْمُ دَھْرٍ ۔ یعنی عمر بھر کا غم لگ جاتا ہے ۔ حضرت علیؓ بڑے فصیح تھے ۔ کیا فصیح اور فصیح اور مقفّٰی جواب دیتے ہیں ۔ حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے ، جب تک آدمی مجرد رہتا ہے ، انسان ہے ، اور جب شادی ہو جاتی ہے تو چارپایہ ہو گیا اور بال بچے ہو جانے سے جکڑ جاتا ہے ۔ بہرحال سب مصیبت ہی مصیبت ہے ۔ (ازالۃ الغین عن آلۃ العین صنہ)

۴۳ ۔ فرمایا حضرت حاجی صاحبؒ نے نواب محمود صاحبؒ رئیس چھتاری کو لکھا تھا کہ آپ مکہ میں بہ نیت ہجرت آنا چاہتے ہیں تو یہاں رہ کر اپنے لئے صرف اتنی رقم منگانے کا انتظام کیجئے جو آپ کے خرچ کے لئے کافی ہو ، تقسیم کے واسطے نہ کوئی رقم ساتھ لانا ، نہ وہاں سے منگانے کا انتظام کرنا ۔ حالانکہ یہ صدقہ تھا جو موجب ثواب ہے مگر مبتدی کو یہ بھی مضر ہے کہ اس جھگڑے میں پڑے کہ صدقہ کس کو پہنچا اور کون رہا اور رقم اب تک کیوں نہیں آئی ، کہاں دیر ہوئی اور اپنے کو دینے والا اور دوسروں کو محتاج سمجھے ۔ ہاں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جیسے اتقیا کو یہ تعلقات مضر نہیں ، ان کی نسبتیں راسخہ تھیں ۔ اس لئے ان تعلقات سے ان کی توجہ مع اللہ کم نہیں ہوتی ۔ (علاج الحرص صنہ)

۴۴ ۔ فرمایا : حضرت فریدالدین عطارؒ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک طالب نے اپنے شیخ سے عرض کیا کہ مجھے حق تعالیٰ کے دیدار کی بہت تمنا ہے ۔ کوئی تدبیر تلایئے جس سے خواب میں دیدار ہو جائے ۔ شیخ نے فرمایا آج رات عشاء کی نماز چھوڑ دو ۔ خواب میں دیدار ہو جائیگا ۔ طالب کو اس تدبیر سے بڑا توحش ہوا کہ شیخ نے کیا فرمایا کہ دولت دیدار معصیت سے حاصل ہو گی ، پھر چونکہ اس وقت تک نماز کبھی قضا نہ کی تھی ۔ اس لئے ہمت نہ ہوئی ، مگر شیخ کے قول کا القا بھی گوارہ نہ ہوا ، تو اس نے یہ فیصلہ کیا کہ لاؤ آج سنتیں چھوڑ دو اور فرض و وتر پڑھ لو سنتوں کا ترک اھون ہے سنتیں چھوڑ کر جو سویا تو رات کو خواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی زیارت ہوئی کہ آپ فرمارہے ہیں، کیوں بھائی ہم نے کیا خطاکی جو تم نے سنتوں کو چھوڑ دیا۔ اس تنبیہ سے فوراً اسکی آنکھ کھل گئی اور اٹھ کر سنتیں پڑھیں۔ صبح کو شیخ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ شیخ نے فرمایا اگر فرض کو چھوڑ دیتے تو خواب میں اللہ تعالیٰ کو یہی فرماتے ہوئے دیکھتے۔ شیخ فریدالدین عطارؒ نے تو یہ قصہ لکھ کر چھوڑ دیا اور اسکی حقیقت مفصل نہ بتلائی کہ فرض چھوڑنے اور دیدار حق ہونے میں کیا ربط تھا۔ صرف مجملاً اتنا لکھا ہے کہ طبیب کبھی زہر سے علاج کرتا ہے۔ بس اتنا لکھ کر چلے گئے اور علمار ظاہر کو صوفیاء پر طعن کرنے کا موقعہ مل گیا کہ یہ مشائخ شریعت کی ذرا عظمت نہیں کرتے کہ شریعت تو فرض کے چھوڑنے پر وعید سناتی ہے اور یہ اجازت دیتے ہیں اور اس پر بشارتیں مرتب کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا دیدار ہوتا اور یوں ہوتا۔ میں حاجی صاحبؒ کو امام وقت اس لئے کہتا ہوں کہ وہ ایسے وحشتناک واقعات کو اس خوبی سے حل فرماتے تھے کہ شریعت پر بھی پورا انطباق ہو جاتا۔ حاجی صاحبؒ نے اس حکایت کو بیان کرکے فرمایا کہ وہ طالب مراد تھا۔ شیخ کو معلوم تھا کہ یہ مراد ہے۔ اگر فرض چھوڑ کر سوئے گا تو حق تعالیٰ اسکو نہ چھوڑیں گے، فوراً خواب میں تنبیہ فرما کر وقت کے اندر اندر اس سے نماز پڑھوالیں گے، پس شیخ نے ترک نماز کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ عمر بھر کے لئے اسکو ایسا پابند کرنا چاہا کہ پھر کبھی اس کا وسوسہ بھی نہ آتا۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی تنبیہ کا عشاق پر خاص اثر ہوتا ہے۔ بہرحال مراد تو اگر خود بھی رکتا ہے تو حق تعالیٰ خود اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ مگر یہ دولت ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی، اور نہ اس میں کسب و اختیار کو دخل ہے، ہمارے اختیار میں مرید بننا ہے اور مرید کے لئے یہی قاعدہ ہے کہ خود محبوب کی طرف چلنے کی کوشش کرے۔ اگر یہ اعراض کرے گا تو ادھر بھی اعراض ہوگا۔ پس اسکو شرم نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ ایسے وقت میں عدو سے شرم کو بلانا چاہئے کہ عدو ئے شرم و اندیشہ بیا (استمرار التوبہ صہ ۳۴)

۴۵۔ فرمایا : حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ سب صاحبان سن لیں۔ میں اپنا بندہ بنانا نہیں چاہتا۔ خدا کا بندہ بنانا چاہتا ہوں، کیونکہ خدا مقصود ہے۔ شیخ مقصود نہیں۔ میرے پاس جو کچھ تھا حاضر کر دیا۔ اس سے زیادہ کی طلب ہو تو میری طرف سے عام اجازت ہے۔ جہاں سے چاہیں مقصود حاصل کریں۔ اگر کسی دوسرے شیخ سے بیعت کی ضرورت ہو تو بیعت کی بھی اجازت ہے۔ (اشرف السوانح صہ ۲۸۶/۱)

۴۶۔ فرمایا : کہ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ اس پر فخر فرمایا کرتے تھے کہ الحمدللہ ہمارے سلسلہ میں سب طلباء اور غرباء کا ہی مجمع ہے اور جس درویش کے یہاں بڑے بڑے لوگوں یعنی

ڈپٹی کلکٹروں وغیرھم کا زیادہ ہجوم ہو تو سمجھ لو کہ وہ خود دنیا دار ہے کیونکہ اَلْجِنْسُ یَمِیْلُ اِلَی الْجِنْسِ۔ (ارواح ثلاثہ صہ ۲۲۴)

۴۷۔ فرمایا: ہمارے حضرت حاجی صاحب ؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو چار مسئلوں میں شرح صدر ہے، ایک مسئلہ قدر، دوسرا روح، تیسرا مشاجرات صحابہؓ، چوتھا وحدت الوجود، اور جب ان چاروں مسئلوں پر حضرت تقریر فرماتے تو سامعین پر ایک اطمینان اور وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ (ارواح ثلاثہ صہ ۲۲۵)

۴۸۔ فرمایا: ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب ؒ کی خدمت میں مثنوی کا درس ہو رہا تھا۔ اور جلسہ عجیب جوش و خروش سے پر تھا۔ اس روز حضرت ؒ نے پکار کر یوں دعا فرمائی۔ اے اللہ ہم لوگوں کو بھی ایک ذرہ محبت عطا فرما، آمین۔ پھر دعا کے بعد فرمایا الحمد للہ سب کو عطا ہو گیا۔ (الہام ہوا ہوگا۔) پھر دوسرے جلسہ میں فرمایا کہ ذرہ سے زیادہ کا تحمل بھی نہیں ہو سکتا ۔

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں
یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم
بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست
جز آں کہ جاں بہ سپارند چارہ نیست

(ارواح ثلاثہ صہ ۲۲۶)

۴۹۔ فرمایا: کہ جب مثنوی کے درس کا وقت آتا تو حضرت حاجی صاحب ؒ یوں فرمایا کرتے کہ آؤ بھی مثنوی کی تلاوت کریں۔ ایک شعر ہے ۔

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآں در زبان پہلوی

اس کا لوگوں نے اسطرح حل کیا ہے کہ اس میں زیادہ مضامین قرآن شریف کے ہیں، لیکن حضرت علیہ الرحمۃ نے عجیب تفسیر فرمائی کہ بھائی قرآن سے مراد کلام الٰہی ہے اور کلام الٰہی کبھی وحی سے ہوتا ہے اور کبھی الہام سے ہوتا ہے۔ تو معنی مصرعہ کے یہ ہیں کہ مثنوی کلام الٰہی یعنی الہامی ہے۔ حضرت ؒ اس تفسیر کی بناء پر تلاوت کا لفظ استعمال فرماتے تھے۔ (ارواح ثلاثہ صہ ۲۲۷)

مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ

گذشتہ سے پیوستہ

حضرت سید صاحبؒ اور شاہ صاحب : جہاں تک باہمی تعلق کا مسئلہ ہے، اس سلسلہ میں بلاخوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شاہ صاحب سید صاحب کے معتمد خصوصی اور تحریک کے روحِ رواں تھے۔ پہلے گذرا کہ بحکم شاہ عبدالعزیز بیعت ہوئے، پہلے مرید تھے۔ پالکی کے ساتھ ننگے پاؤں دوڑنا فخر سمجھتے تھے۔ جنگی گروپ میں خاص مشیرانِ سید بھی دو تھے، مولانا عبدالحی اور شاہ صاحب۔ نیز سید صاحب نے حسبِ ارشادِ خداوندی: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ اور وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ باقاعدہ مجلس بنا رکھی تھی جس کے رکنِ رکین شاہ صاحب ہی تھے۔ (جماعت مجاہدین ص۴۹) اور تحریک کا پورا دفتری نظام شاہ صاحب کی نگرانی میں تھا۔ بقول مہر صاحب جب شاہ صاحب مرکز میں ہوتے تو تمام مکاتیب وہی لکھواتے، سید صاحب مضمون بتا دیتے اور شاہ صاحب اسے جامہ عبارت پہنا کر لکھوا دیتے۔ (جماعت مجاہدین بحوالہ منظورہ ص۵۰) سید صاحب کی مہر پر اسمہ احمد اور شاہ صاحب کی مہر پر واذکر فی الکتاب اسمٰعیل لکھا تھا۔ اور یہ دونوں شاہ صاحب کے پاس رہتیں۔ (ایضاً ص۴۹) شاہ صاحب اور مولانا عبدالحی وقف للتبلیغ تھے۔ (آثار الصنادید بحوالہ جماعت مجاہدین ص۵۰) لیکن معرکہ جہاد میں شاہ صاحب کسی سے پیچھے بھی نہ تھے، یہاں تک کہ ترتیب جیش کے وقت مقدمۃ الجیش کی قیادت انہیں سونپی گئی (شاندار ماضی ج۲ ص۲۰۹) (یاد رہے کہ مولانا عبدالحی ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ واقعہ بالاکوٹ سے تین سال پہلے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، بوقت رخصتی زبان پر تھا الحقنی بالرفیق الاعلیٰ۔ حیات طیبہ ص۵۳۲ تاہم آپ کی زندگی میں جو معرکے ہوئے ان میں آپ بھی شریک رہے)

جنگی اور دفتری و انتظامی معاملات میں شاہ شہیدؒ کے متعلق سرسری تذکرہ آپ نے پڑھ لیا۔ مرزا حیرت نے حیات طیبہ کے صفحہ ۲۸۶ پر بعینہ یہ لکھا ہے اب ہم ۱۲۴۱ھ سے شروع ہونے والی لڑائیوں کا نہایت اختصار سے ذکر کرتے ہیں۔ زیادہ تر مقصد شاہ شہید کے حصہ شرکت کی وضاحت ہے کہ تذکرہ ان کا ہے وباللہ التوفیق جب قافلہ مجاہدین کابل پہنچا تو حکومت و رعیت کے حلقہ میں مشہور ملا محمدؒ سے واسطہ پڑا، پہلے ان کے شاگرد افغان لینے آئے پھر خود شاہ شہید نے خداداد طلاقت لسانی سے انہیں متاثر کیا اور وہ سید صاحب سے بعیت ہوگئے۔ یہ عظیم کامیابی تھی کیونکہ ان کی عقیدت گویا کابل بھر کی عقیدت تھی۔ (حیات طیبہ صفحہ ۲۸۸) پھر پہلی جنگ موضع خویشگی میں ہوئی مجاہدین دریائے لنڈہ کے اسطرف تھے کہ سردار اکوڑہ امیر خان آئے بیعت ہوئے ان کے مشورہ سے دریا کے اس پار جانا پڑا۔ معرکہ کارزار بپا ہوا۔ سکھ لاتعداد لاشیں اٹھا کر لے گئے اس کے باوجود ۲/۱-۲ ہزار سکھ مقتولین کی نعشیں میدان میں پڑی تھیں۔

۲۰ر جمادی الاول ۱۲۴۲ھ ۲۱ر دسمبر ۱۸۲۶ء کو یہ فتح عظیم نصیب ہوئی شاہ صاحب بحکم امیر شریک میدان تو نہ ہو سکے البتہ کمان پیچھے سے وہی کرتے رہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۹۴) دوسرا حملہ حضرو پر ہوا سامان بہت ملا۔ (صفحہ ۲۹۷) تیسرا معرکہ دریائے اباسین کے کنارے ہوا۔ ایک طرف سکھوں کا ٹڈی دل لشکر اور توپیں، دوسری طرف مفلوک الحال گنتی کے مجاہدین بہ قیادت شاہ صاحب، اللہ نے کامیابی عطا فرمائی۔ (صفحہ ۳۰۲) بعدہ مجاہدین نوشہرہ آگئے سرداران پشاور آئے، بیعت ہوئے لیکن بعض شیعہ تھے (تقیہ باز) انہوں نے سید صاحب کے کھانے میں زہر ملا دیا اور سواری کے لئے لنگڑا ہاتھی دیا۔ سید صاحب کی ناگفتہ بہ حالت تھی، شاہ صاحب قیادت نہ کر سکے، یوں بھی امیر کی حالت کا مجاہدین پر اثر تھا۔ نتیجۃً زک اٹھانا پڑی لیکن سبب اسلام کے ابتدائی دشمن شیعہ بنے (صفحہ ۳۰۵) بعدہ لشکر چندلئی چلا آیا، سردار پکھلی نے مدد مانگی شاہ صاحب کی زیر قیادت مختصر لشکر گیا۔ فاقہ سے چور تھے لیکن فتح ہوئی، سامان غنیمت بہت ملا جس سے رسد کی کچھ تکلیف بھی ختم ہوئی اعتماد علی اللہ اور توکل کے یہ کرشمے تھے! جو ایسے ہوں انہی کیلئے ہے — نصر من اللہ و فتح قریب۔ اور ساتھ ساتھ اللہ کی طرف شاہ صاحب جیسا جرنیل عطا ہوا۔ (صفحہ ۳۱۲)

اگلے دن خاص گڑھی پر حملہ ہوا فتح عظیم نصیب ہوئی، یہاں شاہ صاحب کی انگلی زخمی ہوئی فرماتے یہ انگلی شہادت ہے مالک منظور کرے تو میرے لئے کافی سرمایہ ہے۔ (صفحہ ۳۱۶) بعدہ دو ناگہانی آفتیں ٹوٹ پڑیں۔ مولانا عبدالحی کی وفات۔ قائدین و مجاہدین کے لئے صبر آزما سانحہ تھا لیکن

راضی برضا تھے (نحمدہ اللہ بغفرانہ) دوسرے مولوی محبوب علی صاحب دہلوی کا فتویٰ جس سے مجاہدین کی کمک رک گئی لیکن پیارے شہید کے ناخن تدبیر سے یہ گتھی سلجھ گئی اور دشمن ناکام ہوئے۔ (ص ۳۱۹) اس کے بعد اتمان زئی میں جنگ ہوئی بدقسمتی سے دوسری طرف فوج میں اکثر مسلمان تھے (آہ فریب خوردہ مسلمان ہر دور میں دشمنوں کی سازشوں کا شکار ہوا۔) کمانڈر شاہ صاحب نے حکم دیا کہ سوائے سینہ بسینہ جنگ کے کسی کو قتل نہ کریں، بھاگتے ہوؤں کا تعاقب نہ کریں، قیدیوں سے حسن سلوک کریں۔ سردار خیبر گو بیعت ہوچکا تھا لیکن کھوٹے سکے اس کا ضمیر خود بک چکے تھے، وہ بھی شریک دشمن ہوا۔ ہمت مردانہ سے حملہ ہوا سب فرفروا ہوگئے۔ پنجاب پر ایسی دھاک بیٹھی کہ ۲ ہزار سرداروں کے فدویت نامے آگئے۔ (ص ۳۲۳)

آٹھویں جنگ سب سے زیادہ مشہور ہے اس میں مخالفین کا کمانڈر مشہور فرانسیسی جنرل انطورا تھا جس کا رنجیت سنگھ سے وعدہ تھا کہ سید احمد اور شاہ اسماعیل کو زندہ دربار میں لاؤں گا۔ پھر باغی امیر خادی خان (ریاست ہنڈ) نے اسے اور ڈھارس بندھائی، توپیں اور سامان بے حد تھا، جنرل نے دریائے اباسین پار کرلیا، لیکن شاہ صاحب نے دیوار تعمیر کرائی جس میں سید صاحب سمیت سب شامل تھے اس پر برجیاں بنوائیں ان پر توپیں نصب ہوئیں، لشکر کے حصے بنا دیے۔ ہر حصہ کا مخصوص نشان تھا۔ شاہ صاحب نے جھنڈی کیا ہلائی مجاہدین نے ایسا تابڑ توڑ حملہ کیا انطورا اور خادی خان خائب وخاسر ہوکر دوڑے اور اس طرح کہ بمشکل جان بچا سکے۔ (صفحہ ۳۳۲) انطورا نے بزدلی دکھائی بھاگتے ہوئے بہ مشورہ خادیخان مسلمانوں کے گھر جلاتا گیا خادیخان کی سرکوبی ضروری تھی، شاہ صاحب مختصر سی جماعت لیکر راتوں رات قلعہ کو پھاند کر اندر گھس گئے۔ خادیخان کے حواس باختہ ہوگئے۔ کوئی راستہ نہ ملا، ذلیل ہوکر دوڑا شاہ صاحب نے اخلاق کریمانہ کا ثبوت دیا، قلعہ میں کسی کو چھیڑا تک نہیں۔ سامان جنگ پر قبضہ کیا، فتح ہوئی، بعد میں حالات ایسے ہوئے کہ شاہ صاحب گرفتار ہوگئے۔ سید صاحب اور مجاہدین پریشان تھے۔ لیکن شاہ صاحب مردانہ وار قید سے نکل کر للکارتے ہوئے واپس آگئے۔ اور خادیخان کو منہ کی کھانی پڑی۔

مجاہدین سید صاحب سمیت پنجتار میں تھے، خیال آیا کہ کشمیر کو ہیڈکوارٹر بنائیں، لیکن راستہ میں امب کی ریاست تھی جس کا سردار بڑا مغرور تھا، اس نے راستہ روکنا چاہا، ادھر سے حملہ کی تیاری ہوئی، اس نے چال چلی فدویت نامہ لکھا اور پھر شب خون مارنا چاہا، رات کے سناٹا میں اس نے یہ حرکت کی مجاہدین ہتھیار باندھے آرام کر رہے تھے۔ ایسی مدافعت کی کہ اس کو جان کے لالے

پڑ گئے۔ وہ بھاگا اور ایسے کہ پھر پتہ نہ چلا، سید صاحب نے امب کے انتظام کو شرع محمدی کے مطابق کیا، قاضی مقرر کئے، اپنی اور شاہ صاحب وغیرہ کی مہریں بنیں۔ (ص ۲۳۸) اس کے بعد خالصہ فوج نے بدلہ چکانا چاہا، چتر بائی پر حملہ کیا لیکن مجاہدین کی جی توڑ جوابی مدافعت سے عبرتناک شکست کھائی (ص ۲۴۳)

پھر پشاور کا قصد ہوا، شانِ خداوندی کہ ایک قطرہ خون بہے بغیر پشاور قبضہ میں آگیا سردار پشاور پہلے کئی بار بدعہدی کر چکا تھا لیکن مسلمانوں کا عفو و درگذر ایک مثالی چیز ہے۔ اس نے پھر معافی مانگی چنانچہ حاکم وہی رہا، البتہ نظام کو شرع کے مطابق کیا۔ عامل مقرر کئے۔ بدقسمتی سے آپ واپس چلے آئے۔ عاملین سے بعض باتیں ایسی سرزد ہوئیں جو باشندگان علاقہ کو پسند نہ تھیں سردار کا دل پہلے سے گندا تھا۔ سازش سے تمام عامل قتل کر ڈالے، شاہ صاحب اور سید صاحب کیلئے یہ خبر بڑی روح فرسا تھی، وہ مسلمان کی بلندی و کامیابی کیلئے مصائب برداشت کر رہے تھے لیکن نام نہاد مسلم فرماں رواؤں کی بدعہدیاں نکتہ عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ آپ نے دل برداشتہ ہو کر اعلان ہجرت کر دیا اور فرمایا جو چاہے یہاں رہے جو چاہے چلا جائے۔ کچھ لوگ چلے گئے لیکن کچھ

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے ۔۔۔ یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے۔

کہہ کر رک گئے۔ (ص ۲۵۱)

اب سید صاحب کاغان مقیم ہوئے کچھ مکانات بنائے کہ مہاجرین آرام سے رہ سکیں۔ بالاکوٹ ایک محفوظ مقام تھا۔ شہادت سے چند روز پہلے کا ایک مکتوب ملاحظہ فرمائیں:

"فی الحال بالاکوٹ کے قصبہ میں کہ اس کے درّوں میں ایک درّہ ہے، جمعیۃ خاطر کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں، اور کفار کا لشکر بھی مجاہدین کے مقابلہ کے لئے تین چار کوس کے فاصلہ پر ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے لیکن چونکہ مقام مذکور محفوظ ہے، لشکر مخالف خدا کے فضل سے وہاں نہیں پہنچ سکتا۔ (مقالات ص ۱۰۱)

لیکن دشمن چالوں میں لگا تھا اور کسی کا ضمیر خریدنے کی فکر میں تھا کہ سراغ ملے۔ راستہ تنگ تھا، بمشکل ایک آدمی وہاں سے گذر سکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ آپ توپیں ساتھ نہ لا سکے تھے۔ راستہ میں مختلف گاؤں کے لوگوں کو امانت کے طور دے گئے تھے۔ رؤسا بالاکوٹ بے ایمانی و ضمیر فروشی کا مکروہ دھندا نہ کرتے تو آپ جمعیت خاطر سے اگلا پروگرام سوچ سکتے۔ لیکن تاریکی کے بادل ہنوز چھٹے نہ تھے۔ مسلمانوں کے سروں پر مسلط ہونے والا تاریک سایہ غلامی ابھی باقی رہنا

تھا۔ یکا ئک مال نے دشمن سے ساز باز کی وہ دوڑ آیا، یہاں مختصر جماعت تھی، سامان پاس نہ تھا، شاہ صاحب سمجھ گئے کہ آخری میدان ہے اور وقت آخر ہے، جی توڑ کر لڑو، چنانچہ لڑے اور ایسے کہ بقول الیگزنڈر موت کے بعد سو سے زیادہ زخم تھے۔ شاہ صاحب اور سید صاحب حیاتِ جاودانی حاصل کر گئے۔ سرزمین بالاکوٹ کو اپنے خونِ مقدس سے رونق بخشی، مکینوں کی پیشانیوں پر سیاہ داغ لگا۔ اس کلنک کے ٹیکہ نے دارالاسلام کا تصوّر قصہ پارینہ بنا دیا۔ انگریز نے چراغ جلائے اور ۲ سال بعد باقاعدہ حکمران بن گیا یعنی بقالی سے حکمرانی۔ (تمام مرتبہ داسطہ مولانا سندھیؒ)

یہ واقعۂ عظمیٰ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۵ مئی ۱۸۳۱ء یوم جمعہ کا ہے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

"بالاکوٹ کا چپہ چپہ ہندوستان کے آخری مسلمان مجاہدین کے پاکیزہ خون سے رنگین ہو چکا ہے یہ وہی مقام ہے جہاں تاریخِ ہند کے عہد اسلامی کی چند عظیم النظیر ہستیاں محو استراحت ہیں۔"

یہ خراجِ عقیدت ہے ایک مبصر و مورخ کا اس سرزمین کو جسے بالاکوٹ کہتے ہیں، اور جس نے اپنے جگر کو چیر کر اس مقدس امانت کی حفاظت کی ہے اور یوں روضۃ من ریاض الجنۃ ہونے کا شرف حاصل کیا ہے، جہاں مقصدِ عزیز کی خاطر خونِ مسلم کا ایک قطرہ بہے اس مقام کی رفعت و عظمت اوجِ ثریا سے ماوراء ہے تو جہاں سید احمد اور شاہ اسمٰعیل جیسوں کا خون بہا اس مقام کی رفعتوں کا کیا ٹھکانہ ۔۔۔؟

مگر افسوس کہ وہاں کے مکینوں نے ان نو وارد مجاہدین کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا جن کے دل سوزِ ایمان سے لبریز تھے اور جنہوں نے اسلام و مسلمان کی سربلندی کیلئے جان ہتھیلی پر رکھ چھوڑی تھی واحسرتا غداری ایک ایسی مقدس جماعت سے جسکی جفاکشی ایک مفکر کیلئے سامانِ حیرت پیدا کرتی ہے۔" ذرا اس گیت کو ملاحظہ فرمائیں، جفاکشی اور مقصد سے وارفتگی کے یہ نمونے دنیا نے کم دیکھے ہوں گے۔

کافر کے خلاف جنگ مسلمانوں کا فرضِ اوّلین ہے۔ سب کام چھوڑ کر اسکی تیاری کرو۔ جو شخص اس مقصد کے لئے ایک پیسہ دے دوسری دنیا میں سات سو گنا اجر ملے اور جو بذاتہ شاملِ جنگ ہو اسے سات ہزار گنا۔ جو ایک مجاہد کو ہتھیار دے اسے ثوابِ شہادت ملے۔ بزدلی کو خیر باد کہو، اپنے روحانی قائد کے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ اور کفار پر ضرب کاری لگاؤ۔ ہزاروں لوگ میدان میں جاتے ہیں لیکن ان کا بال بیکا نہیں ہوتا۔ اور ہزار ہا گھر میں رہتے ہیں مگر موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ مقدس جماعت تھی جس کے قائد کے متعلق ہنٹر یہ کہتا ہے: ان کا دھیان خدا کی طرف

تھا اور روح ہم وطنوں کی نجات کے لئے تڑپتی رہی۔ (کیا ہم وطن سکھ کے مظالم کا شکار تھے یا انگریز کے) بدعہدی اس جماعت سے جو خدائی خدمتگار تھے، اور جن کا مقصد علم الٰہی کو بلند کرنا تھا، اور جن میں رضائے ایزدی اس درجہ موجود تھی کہ معرکہ کارزار میں جب سر تن سے جدا ہو گیا تو خون کا ہر قطرہ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا۔

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

درحقیقت ایثار و قربانی اور جذبۂ فدائیت کا یہ آخری نظارہ تھا جس کے متعلق یوسف سلیم چشتی کا یہ اقتباس سراسر مبنی بر صداقت ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کا یہ آخری نظارہ تھا جو چشم ہند نے دیکھا اس کے بعد ایسا انقلاب عظیم رونما ہوا کہ مسلمان جہاد تو درکنار تلوار سے بھی محروم ہو گئے۔

کتنی سچی حقیقت ہے۔ پھر غلامی کی تاریک شب جس طرح دراز ہوئی اس سے کوئی انکار کر سکتا ہے، اور اس تاریکی کے مکردہ اثرات یعنی تبدیلی قلوب سے تو تاہنوز چھٹکارا نہیں ہوا فیا للعجب، ان سیاہ بخت، خونخوار، درندہ صفت، بے ضمیر، بدعہد اور قوم فروش لوگوں نے ان کا کیا بگاڑا۔؟ کچھ بھی نہیں بلکہ یہاں تو بل احیاء کا اعلان ہے اور اس حیات کو انسانی شعور سے ماوراء قرار دیا جا رہا ہے۔ ولکن لا تشعرون۔ نیز مردہ گمان کرنے کی ممانعت ہے۔ لا تحسبن الذین قتلوا الآیۃ۔

اور دوسری طرف خود کیا حاصل کیا آنے والی نسلوں کی لعنت ملامت۔ خدا کی طرف سے دنیا میں ذلت و مسکنت جس کا نظارہ چشم بصیرت آج بھی کر سکتی ہے ــــ رہ گیا اگلا جہاں، تو یہ خون میں لت پت حاضر ہوں گے۔ حضرت حق کے وارے نیارے ہوں گے، حوران جنت جان چھڑکیں گی، پیغمبر باعظمت امتیوں کو دیکھ کر فخر محسوس کرے گا۔ دوسری طرف روسیاہی ہوگی۔ ٹھکانہ ڈھونڈیں گے ملے کہاں سے؟ شجرہ زقوم، ماء کالمھل اور ماء حمیم سے دو چار ہونا پڑے گا۔ ان بطش ربک لشدید۔

اعاذنا اللہ منھا ومن بطشہ وغضب نبیہ ولعنۃ ملائکتہ ومن عذاب النار۔

اختتام سے پہلے سرسری تذکرہ شاہ شہید کے علمی سرمایہ کا ضرور ہے۔ شاہ صاحب کو فرصت نہ ملی، ملتی تو اسلامی لٹریچر کو اتنا کچھ دے جاتے کہ نسلیں فخر کرتیں۔ تاہم مختصر مدت میں تقویۃ الایمان جیسی کتاب تو دے گئے جس نے بقول مولانا گنگوہیؒ ان کی زندگی نے ۲، ۲½ لاکھ انسانوں کی کایا پلٹ دی (ارواح ثلاثہ ص۶۳) اور جس کو وقت کے اجلہ علماء کی مہر تصدیق کے بعد اشاعت

کے رکھ دیا۔ (ایضاً) علاوہ رسالہ یک روزی (تقویۃ الایمان پر مولوی فضل حق صاحب کے اعتراضات کا جو ایک دن ہی میں ایک مختصر نشست میں قلم برداشتہ لکھا۔) تنویر العینین، منصب امامت، اصول فقہ، صراط مستقیم (مشتمل بر ملفوظات حضرت سید احمدؒ و مقام تجدید) جیسا سرمایہ علمی ان کی یادگار ہے۔ نیز حقیقت تصوف (ناپید) حیات طیبہ ص۱۶۱ الاخوۃ ہند ڈ ص۶۷ (حیات طیبہ) نیز تفسیر قرآن لکھنے کا ارادہ کیا۔ عم مکرم نے کہا نئی بات ہو تو لکھو کہ تفسیریں بہت ہیں تو ارادہ ترک کر دیا۔ (حیات طیبہ) علاوہ ازیں مکتوبات، ملفوظات، خطبات، اشعار کا ضخیم ذخیرہ جس کا کافی حصہ زمانہ کی بے اعتنائی کی نذر ہو گیا، تاہم کافی محفوظ ہے ۔۔۔ مسلکاً حنفی تھے، گو ابتدا اباء عن التقلید تھا مگر بعد میں حنفیت کو اپنایا۔ (محققین کا یہی فیصلہ ہے واللہ اعلم) زمانہ اباء میں بھی امام صاحب کی عظمتوں کے بصدق دل قائل تھے۔ (حیات طیبہ ص۹۵) طبیعت میں اعتدال تھا افتراق جماعت سے سخت متنفر تھے، مولوی قاسم صاحب امام عیدگاہ آپ کے شدید مخالف تھے۔ لیکن عید وہیں پڑھتے، سوال پر فرماتے کہ افتراق جماعت سنگین جرم ہے، اللہ کے غضب کا سبب۔ (حیات طیبہ ص۱۸۱) انگریزی فتنہ سامانی کے شکار اور نکتہ چینیاں شہید کیلئے اس کے بعد توبہ لازم ہے ورنہ مقدس خون کے چھینٹے روز محشر دامن پکڑیں گے، پھر امامشکل ہو جائے گا۔ نیز افتراق جماعت پر جی جان سے راضی ہونے والے اور عقائد کی بحث کو تشدد کے مہلک ہتھیار سے تسلیم کرنے والے بزرگوں کو بھی غور و فکر سے کام لینا چاہیے ۔۔۔ اصول تبلیغ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ ہے بلکہ مجادلہ بھی ہو تو احسن طریق سے۔ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔ تشدد اور درشتی زبان اللہ کو پسند ہوتی تو بقول رئیس الاحرار چوہدری افضل حق مرحوم چرمے کی زبان نہ ہوتی لوہے کی ہوتی۔ شیریں مقالی، مہذبانہ اور سنجیدہ گفتگو شیوہ مسلم ہونا چاہیئے، مخالفین کو کوسنا عقل و دانش نہیں کسی کے باپ کی وہی توہین کرے گا جو دوسروں کے بزرگوں پر گند اچھالے۔ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ۔ (القرآن) خداوند قدوس اسلاف کے نقش قدم پر چلائے ان کے دامن عقیدت سے سچی وابستگی نصیب فرمائے، اسی میں کامیابی ہے اور اس کے بعد ان کے مشن کی تکمیل ممکن ہے خدا توفیق بخشے۔ حرف آخر کے طور پر نواب سر محمد ناصر الملک مرحوم مہتر آف چترال کے تین شعر بہ یاد شہید ملاحظہ فرمائیں:

ہندیان خفتہ را بیدار کرد — بندگان نفس را احرار کرد

اے ذبیح اللہ اسمٰعیل ما — شد فدایت صور اسرافیل ما

گفت اسماعیل معبود ہم خدا است — پیشوائے من محمد مصطفٰے است

تربیت و تزکیہ

مدنی شیخ رح کی مجلس میں

ملفوظات حضرت مولانا الشیخ عبدالغفور العباسی
مہاجر مدینہ قدس سرہ

جامع و مرتب
احقر سمیع الحق غفرلہ بزمانہ قیام مدینہ ۱۳۸۳ھ
مقام
مدینہ طیبہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام
زمانہ ملفوظات
۲۲ر رمضان المبارک تا ۲۰ر ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ

گذشتہ سے پیوستہ

فرمایا: عورتوں کا مساجد میں جانا بھی آجکل فیشن بن گیا ہے، مسجد نبوی میں فیشن کر کے جاتی ہیں اور وہاں جا کر باتیں کرتی ہیں اور گپ لگاتی ہیں، بلکہ اکثر لوگ آجکل "حج کردن تماشا جہاں بودن" کا مصداق بن گئے ہیں۔ روح حج کی طرف آجکل بالکل توجہ نہیں۔ لوگوں نے اسے سیر و سیاحت بنالیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آداب حج برکات حج اور صحیح حج نصیب فرمائے۔

ایک مریض کو مخاطب ہو کر فرمایا اس سفر میں مرض کا آنا، تکالیف کا آنا، سب کفارہ ہے۔ ترقی درجات ہے، اور یہ تکلیف بھی ضیافت نبوی ہے۔

فرمایا: تصوف کی روح اتباع سنت اور درستگی اخلاق و عبادات ہے۔ میرا ایک رفیق تھا، میں نے اسے ایک دفعہ ڈانٹا اور ناراض ہوا، تو اس نے مجھے لکھا کہ تم اچھے اچھے کھانے کھاتے ہو، میں نے کہا کہ میرے بزرگ تصوف خشک کھانے اور تر کھانے کا نام نہیں — بلکہ "حسن المعاملۃ مع الخلق والخالق" کا نام ہے۔ کہ مخلوق کو بھی دھوکہ نہ دے اور خالق کو بھی دھوکہ نہ دے۔ آجکل اس چیز کا لحاظ کم ہے لوگ کشف و کرامت، خوارق عادات وجد اور حالات میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند رح فرماتے ہیں کہ "کشف را بر کفش زند" یہ سب قشور (چھلکے) ہیں۔ ان کو پھینک دینا چاہیے۔ مقصد صرف قرب حق رضائے حق ہے

اور وہ محصور ہے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات و اطوار میں ہر صورت میں جہاں بھی امکان ہو، معاملات ہوں، عبادات ہوں، اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا ہر چیز میں۔

فرمایا: "نظر بر قدم" کے بارہ میں میرے شیخ فرماتے تھے کہ نظر بر قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ سالک کو ہر وقت حضورؐ کے قدم پر نظر رکھنی چاہیے۔ عادات، اطوار، عبادات اور معاملات میں۔

فرمایا: ایک شاذلیؒ بزرگ نے فرمایا کہ مدینہ طیبہ کے کسی ایک پتھر کو عقیدت اور محبت سے دیکھنا قطب اور غوث کے دیکھنے سے بہتر ہے۔ حضورؐ کے قدمین شریفین نے ان گلیوں کو مس کیا ہے پھر حضورؐ کی نظر کیمیا اثر سے تو مدینہ کے آس پاس کی کوئی جگہ خالی نہیں رہی۔ عقیدت، اور ادب و احترام کی ضرورت ہے، پھر یہاں سے کوئی شخص خالی نہ جائے گا۔ سید مصطفیٰ علیہ السلام کا دروازہ تو قیامت تک کھلا ہے جس کا جی چاہے وہ آئے اور لے جائے۔ ع

این درگہ ما درگہ نا امیدی نیست

دین اور دنیا دونوں یہاں ملتے ہیں مگر محبت اور عقیدت شرط ہے۔ ——

فرمایا: ایک دفعہ میں مدینہ طیبہ پیدل آرہا تھا، میرے بھائی مولوی عبدالقیوم صاحب جنکا انتقال ہو چکا ہے۔ اور ایک دوسرے بزرگ مولانا مستجاب خان چترال والے ساتھ تھے، جو صحیح العقیدہ، شب خیز، کم سخن، تہجد گزار ہے، عاشق ہے، حضورؐ کا نام سنتا ہے تو گریہ طاری ہوتا ہے۔ ہم تینوں کا سفر پیدل تھا، جب "بیر الشیخ" پہنچے، خادم میں تھا دونوں کا، مولوی صاحب عمر میں مجھ سے کچھ بڑے تھے یا قریب، اور بھائی چھوٹا تھا۔ مستورہ سے بیر الشیخ تک کی منزل بہت سخت تھی، مولوی صاحب نے کہا تھکاوٹ اور سفر کی خشکی بہت چڑھ گئی ہے، آج ہمارے لئے پلاؤ پکاؤ۔ پکایا۔ کھا کر سو گئے تو خواب میں دیکھا کہ مسجد نبوی میں حاضر ہوں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہیں۔ اور سو رہے ہیں، مصافحہ کا خیال آیا، مگر آرام کے خیال سے تعرض کرنا مناسب نہ سمجھا اسی درمیان اپنے آپ کو خواب میں بیر الشیخ میں دیکھا کہ والدہ بھی ساتھ ہے اور دیکھا کہ حضورِ اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام وہاں تشریف لائے ہیں شیخین (ابوبکرؓ و عمرؓ) بھی ساتھ ہیں میں نے والدہ سے کہا کہ میری خواہش ہے کہ حضورؐ کو دعوت دوں۔ فرمایا کہ ہزاروں لوگ ہیں، کس کی دعوت قبول فرمادیں گے۔ ؟ میں نے کہا میری دعوت اخلاص کی ہے قبول کر لیں گے۔ اسی خیال میں تھا کہ جاگ اٹھا۔ وہاں سے ابیار حسانی کی منزل سات آٹھ گھنٹے کی ہے، ہم ذرا دیر سے

ظہر کے بعد نکلے، چلتے چلتے صبح کا وقت ہوا، دیر سے نکلے تھے، ابھی منزل آئی نہیں تھی مگر اس وقت اندازہ یہ ہوا کہ منزل تک ۱۵ منٹ کا راستہ ہوگا۔ بھائی کو میں نے پانی کی مشک اور چھتری دی اور خود استنجا کرنے ٹھہرا، فارغ ہوا تو غلطی سے دائیں طرف چلنے لگا اور منزل کا راستہ غلط ہوگیا۔ چلتے چلتے دوپہر ہوئی، نہ پانی نہ چھتری نہ ساتھی، جنگلی راستہ تھا جس میں کسی انسان کی آمد و رفت نہیں تھی، اب سمجھا کہ حالت خراب ہے، سخت گرمی کا موسم، زندگی سے ناامید ہوا، پیاس بے انتہا تھی، خشک لُو اور رات بھر کا چلا ہوا کہ اتنے میں ایک درخت نظر آیا اور خدا شاہد ہے کہ میں اس خیال سے ادھر چلنے لگا کہ وہاں جان دے دوں، کیکر کا درخت تھا جس میں پتے بھی نہ تھے، تو زندگی کی ظاہری امید کوئی نہ تھی۔ وہاں پہنچا تو خدا کی شان کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑی اور ٹھنڈی مشک لٹکی ہوئی ہے اور ایک بدو نے پلاؤ کی ایک دیگ چڑھائی ہے اور بار بار کہتا ہے کہ اہلاً و سہلاً و مرحباً بضیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (نبی کریمؐ کے مہمان کو خوش آمدید) فوراً پانی نکال کر پلایا اور پلاؤ کی پلیٹ بھر کر میرے سامنے رکھ دی، میں سمجھا کہ رحمت کا فرشتہ ہے جسے خدا نے یہاں بھیج دیا ہے۔ پھر اس نے چائے بنا کر پلائی، اور کہا کہ دوسری منزل کو ایک گھنٹے کا راستہ ہے، پہلی منزل تم نے ختم کر لی ہے۔ اور تمہارے رفیق آدھی رات کو پہنچیں گے۔ اور تم ابھی سے پہنچ گئے ہو اگر یہاں آرام کرنا چاہو تو تمہاری مرضی ورنہ ابھی روانہ ہو کر وہاں سو جاؤ، میں احتیاطاً اُسی وقت اکیلا روانہ ہوا۔ شفیہ منزل پہ پہنچا اور وہاں لیٹ گیا۔ صبح اشراق کے وقت ان کا قافلہ آیا بھائی بھی تھے اور مولانا چترالی بھی، انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا کہ لوگوں نے تمہاری تلاش سے منع کر دیا تھا کہ زندگی ہو تو مل جائے گا ورنہ تلاش میں تم بھی ختم ہو جاؤ گے۔ الغرض میں نے یہ چشم دید واقعہ دیکھا کہ میرے لئے خدا نے جنگل کو منگل بنا دیا۔ میرے پاس کچھ پیسے چار پانچ قرش تھے۔ ساتھیوں کو دینے لگا کہ ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے کہا نہیں تم تو حضور اقدسؐ کے مہمان تھے۔ الغرض یہ سفر آخرت کا سفر ہے۔ تکالیف پیش آتی ہیں جن پر خوشیاں کرے، صبر کرے۔ اب تو موٹر ہے، برف ہے، پانی ہے، تربوز تک مل جاتا ہے۔ اور عرفات میں ہر چیز مہیا ہو جاتی ہے۔ اس زمانے میں لوگ منیٰ سے عرفات تک دو تین ریال کا پانی پی لیتے تھے، مولوی لطف اللہ صاحب (حضرت صاحبؒ ملفوظات کے بھتیجے جو سامنے موجود تھے) کے والد صاحب نے ایک دفعہ صرف منیٰ سے عرفات تک ۵ ریال کا پانی خرید کر پیا، ٹھنڈا بھی نہ تھا، چھوٹے چھوٹے شربے (مٹی کی چھوٹی

سی صراحی) تھے۔ اس وقت لوگ اس سفر میں قدم قدم پر نفل پڑھتے تھے۔ تمام راستے میں اوراد، اذکار اور تلاوت قرآن کرتے تھے۔ اور ہر چیز کو ذوق شوق سے دیکھتے تھے، اب تو لوگوں نے سفر حج کو تجارت بنا دیا۔ بازاروں میں گھومتے ہیں۔ مقصد ہی بھول گئے۔ اب نہ دعا ہے نہ ذکر واذکار نہ تلاوت، کچھ وہاں سے لانا اور کچھ یہاں سے نکالنا تو صحیح حج بہت بڑی محنت ہے اور اس زمانہ میں تو یہی حج کی شکل میں جہاد رہ گیا ہے۔ اب کفار سے جہاد کہاں۔؟ اب تو کفار، مشرک، بدعتی سب سے ملتے ہیں۔ ان کی نقلیں صورت سیرت چال ڈھال میں اتارتے ہیں۔ حرمین میں انگریزی بال، ننگا سر اور نکٹائی، معلوم نہیں کہ یہ کونسا مقام ہے۔؟ انبیاء کرام حرم مکی میں داخل ہو کر ادباً مع الحرم اپنے جوتے اتار لیتے تھے۔ ہم تو روضہ شریف تک غلاظتوں سے بھرے ہوئے جوتے لیجاتے ہیں۔ — اور اصل چیز ادب ہے، اللہ تعالیٰ توفیق دے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت لباس صورت، سیرت، اخلاق و عادات میں نصیب کرے — پھر تو مزا ہے نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ —— (جاری ہے)

ساوات کے ایک معزز متقی گھرانے میں جمعہ ۱۰ر ذی الحجہ سنہ ۱۲۹۲ھ کو طلوع صبح کے وقت شہر حیدرآباد (دکن) میں ایک بچہ پیدا ہوا، عارف باللہ باپ نے اس نومولود کا نام عبداللہ رکھا۔ صوفیاء کرام کا کہنا ہے کہ قطب ارشاد کا نام دنیا والے خواہ کچھ ہی رکھیں، ملاءِ اعلیٰ میں "عبداللہ" ہی ہوتا ہے، باپ کی فراست نے کیا عجب کہ اپنے نونہال کے آئندہ رتبہ کو اسی وقت دیکھ لیا ہو، کیونکہ

؎ قلوب العارفین لہا عیون ترىٰ ما لا یراہ الناظرون[1]

چنانچہ یہی صاحبزادہ عبداللہ میاں بڑے ہوکر عالم و معلم بنے، سالک عارف اور شیخ طریقت ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے دونوں جہتوں سے اتنا بلند و بالا کر دیا کہ محدث جلیل اور قطب ارشاد مانے گئے۔۔۔۔

خاندان | مولانا ابوالحسنات سید عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اجداد عادل شاہی دورِ حکومت میں دکن آکر شہر نلدرگ میں جو اس وقت علماء و صلحاء کا مرکز تھا، بس گئے تھے۔ اس وقت کا یہ عظیم شہر آصف جاہی مملکت کا ایک معمولی تعلقہ بن کر رہ گیا تھا، اور اب اس قابل بھی نہ تھا کہ کسی تشنۂ علم علم کی سیرابی یہاں ہو سکتی، لاچار مولانا کے والد ماجد مولانا سید مظفر حسین رحمۃ اللہ علیہ بلدۂ حیدرآباد چلے

---

[1] (ترجمہ) عارفین اپنی قلبی آنکھ سے وہ کچھ دیکھ جاتے ہیں جو عام انسانی نگاہ دیکھ نہیں سکتی۔

آئے، علم دین کی تحصیل کی اور پھر اپنے وقت کے سب سے کثیر الفیض نقشبندی بزرگ حضرت
مسکین شاہ[1] قدس سرہ سے بیعت کر کے خرقہ خلافت حاصل کیا اور محلہ حسینی علم میں مستقل سکونت
اختیار فرمائی، امراء و اعیان حکومت ان کی توقیر کرتے تھے، اور عوام کو ان سے عقیدت تھی، وہ
بڑے بڑے لائق، جلالی شان کے صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، ان کا وصال سو
برس سے زائد کی عمر میں اس وقت ہوا جبکہ ان کے نور نظر درس و مشیخت کی یکجائی مسند پر جلوہ فرما
ہو چکے تھے۔ باپ کے دل میں اپنے فرزند کی وہ عظمت تھی کہ اہل تخصیص سے فرمایا کرتے:

"عبداللہ میاں کے سامنے میری کوئی حیثیت نہیں۔"

تعلیم | مولانا سید منظفر حسین[2] دارالعلوم دیوبند کی علمی عظمت کے معترف تھے، اس لئے
حضرت مولانا سید عبداللہ کے ابتدائی معلم ایک فاضل دیوبند ہی مقرر ہوئے۔ پھر معقولات کی اعلیٰ
کتابوں کی تکمیل مولانا منصور علی خاں رحمۃ اللہ علیہ[3] سے ہوئی، تفسیر اور ہیئت وغیرہ مولانا انوار اللہ خاں
(نواب فضیلت جنگ)[4] سے کی، فقہ مولانا حبیب الرحمٰن سہارنپوری سے پڑھی اور سند حدیث
مولانا حکیم عبدالرحمٰن سہارنپوری (فرزند استاذ المحدثین مولانا احمد علی سہارنپوری) سے حاصل کی اور حدیث
شریف میں ان کے خاص اور امتیازی شاگرد مانے گئے،

تکمیل سلوک | اپنے والد ماجد کے تعلق سے مولانا بچپن ہی میں حضرت مسکین شاہ صاحب
سے بیعت ہو چکے تھے۔ مگر تحصیل علم کی مدت میں بلکہ عالم ہو کر بھی تکمیل سلوک کیطرف کوئی توجہ نہ تھی

---

[1] آپ شاہ سعد اللہ نقشبندی (قدس سرہ) نزیل حیدر آباد دکن کے خلیفہ تھے جن کو قطب ارشاد شاہ غلام علی
دہلوی قدس سرہ سے خلافت حاصل تھی۔۔۔ حضرت مسکین شاہ کا دامن فیض بہت وسیع تھا، شاہ و گدا سب
ان سے فیضیاب تھے، ہزاروں ہزار عوام اور سینکڑوں خواص کے علاوہ تو آصف سادس نواب میر محبوب علی خان
بھی آپ ہی کے مرید تھے۔ [2] بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے شاگرد خاص و عاشق زار
اور ان کے پہلے سوانح نگار تھے، بڑے طبیب، پایہ کے محدث اور ماہر معقولات تھے۔ بیعت کا تعلق قطب عالم
حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ سے تھا، آخر شیخ عالی مقام کی کشش نے مکہ مکرمہ کا جذب عطا کیا اور
جنت المعلیٰ ان کی ابدی راحت گاہ بنی رحمۃ اللہ علیہ۔ [3] حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے خاص شاگرد
اور شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔ حیدر آباد میں مدرسہ نظامیہ
کی دینی درسگاہ قائم کی اور حیدر آباد کے آخری تاجدار نواب میر عثمان علی خان کے اتالیق بھی رہے، معرکہ کی تصانیف
چھوڑی ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

خیال یہی تھا کہ عالمانہ شان سے زندگی گزار دیں گے، مگر عین اس دورِ شباب میں ایک اتفاقی حاضری حضرت سید محمد پادشاہ بخاریؒ کی خدمت میں ہو گئی جو حضرت شاہ سعد اللہ صاحب مجددیؒ ہی کے دوسرے خلیفہ تھے۔ اور سلسلہ قادریہ میں بھی حضرت سید خواجہ احمد بخاریؒ سے اجازت وخلافت رکھتے تھے۔ بس اس ایک ملاقات میں علم کا دلدادہ معرفت کا جویاں بن گیا، شاہ بخاری نقشبندی و قادریؒ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا، پورے اتباع و انقیاد سے تکمیلِ سلوک میں لگ گئے اور کمال کو پہنچ کر اپنے شیخ کامل و مکمل کے تنہا خلیفہ بنے۔

درس وارشاد مولانا ان ظاہری و باطنی کمالات کو لئے ہوئے اپنی پنجوقتہ نماز کی مسجد مسجد علی آقا۔ (جو قطب شاہی دور کی یادگار ہے) کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر درسِ حدیث و تفسیر بھی دینے لگے، اور کوئی طالبِ مولیٰ آگیا تو اسکی رہبری کو بھی قبول فرماتے گئے، ابتداءً علم کے طلبگار زیادہ آتے رہے اور جویانِ معرفت خال خال کچھ ہی عرصہ میں مولانا کے درس کا چرچا ہو گیا۔ مدرسہ نظامیہ کیطرف سے مدرسی کی پیشکش ہوئی، مگر مولانا نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ علمِ دین کو ذریعہ معاش بنانا منظور نہیں۔

مولانا ویسے تو سکوت مجسّم تھے مگر ان کا درس تفہیم، تحقیق اور تاثیر ہر اعتبار سے بہترین ہوتا تھا، راقم الحروف کو قرآن و حدیث میں تو نہیں البتہ گلستان (سعدیؒ) میں حضرت کی شاگردی کا شرف حاصل ہے اور ذاتی تجربہ کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اُن اساتذہ میں سے تھے جو استاذ گر ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک بات پیش کروں، لڑکپن میں درسِ گلستاں میں محاورہ آیا "در افواہِ عالم افتاد" میں نے اس کا ترجمہ کیا بات مشہور ہو گئی، حضرت نے فرمایا یوں نہیں، اس کا لغوی ترجمہ کیجئے میں نے اور الفاظ کا ترجمہ کر دیا مگر "افواہ" کا ترجمہ نہ کر سکا تو فرمایا: افواہ جمع ہے "فوہ" کی اور "فوہ" اصل میں ہے "فم" اور "فم" عربی میں کہتے ہیں "منہ" کو، پس "در افواہِ عالم افتاد" کا ترجمہ ہوا "دنیا کے منہوں میں پڑ گئی" یعنی بات مشہور ہو گئی۔ اس ادنیٰ مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کہ حدیث و قرآن کے درس میں تحقیق اور تفہیم کے جوہر کیسے کھلتے ہوں گے۔

مولانا کے درس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ گو وہ مجلس درس کو محفلِ پند و وعظ قطعاً نہیں بناتے تھے، مگر ہر شاگرد اُن کی صحبت میں بیٹھ کر دین کے عملی ذوق و شوق کو لئے ہوئے اٹھتا تھا، یہ ان کی باطنی نسبت عالی کا اثر تھا،

مولانا کے درس حدیث شریف میں ایک جن کی شرکت تو وثوق سے معلوم ہے، زائد کا

اس ناچیز کو علم نہیں، شروع کا حال تو معلوم نہیں مگر اپنے آغازِ شعور میں درسِ حدیث کا وقت مولانا کے ہاں بعد نماز عشاء ہی کا پایا اور شرکاءِ درس میں جوان عمر اور ادھیڑ عمر طالبانِ علم نظر آئے۔

ریاضت و مجاہدہ اور عزیمت | مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے جو ارشاد فرمایا ہے ؎

انبیاء را کارِ عقبیٰ اختیار — کافراں را کار دنیا اختیار

انبیاء چوں جنس علییں بدند — سوئے علییں بجان و دل شدند

حضرت مولانا سید عبداللہ نور اللہ مرقدہٗ کی ساری زندگی اسی حقیقت کا عکس قائم تھی، وہ کسبِ معاش اور دیگر امورِ حیات میں بے ہمت اور بے پروا دکھائی دیتے تھے، مگر چونکہ "زمرہ علیین" میں ان کی شمولیت مقدر تھی۔ اس لئے دین کے کاموں میں اور سلوک کی راہ میں ہمت عالی اور عزم قوی رکھتے تھے، مجاہداتِ غزالیہ[1] (یعنی کم کھانا، کم سونا، کم بولنا، اور مخلوق سے کم ملنا) کا اس دور میں وہ نمونہ تھے۔ اور اصولِ غجدوانیہ[2] (وقوف قلبی، وقوف عددی، وقوف زمانی، ہوش در دم، نظر بر قدم، سفر در وطن، خلوت در انجمن، یاد کرد، بازگشت، نگہداشت، یادداشت) کی حقیقت ان کو دیکھ کر سمجھ میں آتی تھی۔ یہ شاعری یا مبالغہ نہیں، عینی شہادت ہے۔

گلستان پڑھنے کے زمانے میں راقم عاجز سے کبھی کبھی حاضری ناغہ بھی ہو جاتی تھی، ایک مرتبہ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ "آپ کے وقت میں میں ہر کام سے فارغ ہو کر بیٹھ رہتا ہوں، نہ آسکیں تو اطلاع دیا کریں۔" پھر فرمانے لگے "مجھے اپنے شیخ کی صحبت بیس برس تک حاصل رہی اور فجر کی نماز روزانہ حضرت کے ساتھ ادا کی اور اس معمول میں فرق نہ آنے دیا۔" حالانکہ حضرت بخاری شاہ قدس سرہٗ مولانا کی قیام گاہ سے تقریباً ۴ میل کی مسافت پر قیام پذیر تھے اور آمد و رفت پاپیادہ رہتی تھی۔

میرے تایا مولوی غلام جیلانی صاحب مدظلہٗ جو حضرت کے اولین مریدوں میں سے (اور اب تو خلیفہ مجاز) ہیں، فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ مولانا شدید بخار میں مبتلا تھے کہ اٹھنا بھی مشکل تھا مگر جب وقت نماز کا آگیا تو مسجد کے ارادہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، میرے تایا صاحب ساتھ تھے، چند قدم چل کر مولانا ضعف اور غشی سے راستہ ہی میں بیٹھ گئے، مگر پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور قدم بڑھایا۔ تایا صاحب نے عرض کیا "حضرت ایسی حالت میں تو شریعت نے رخصت دی ہے۔"

---

[1] امام غزالی قدس سرہٗ [2] حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ جنکے گیارہ کلمات سلوک نقشبندیہ کے اصول کی حیثیت رکھتے ہیں، تفصیل فن کی کتابوں میں دیکھنی چاہئے۔

شیخ فانی نے کس عبدیت میں ڈوب کر اس کا جواب دیا، فرمایا: "جی ہاں مگر میری تو زندگی ہی رخصت ہی رخصت ہے، نہ کمانا مجھ سے ہوتا ہے، نہ دنیا کا اور کوئی کام، ایک نماز باجماعت رہ گئی ہے۔ تو کیا اسکو بھی رخصت کر دوں۔۔؟ مجھے تو رشک آپ لوگوں پر آتا ہے کہ ملازمت بھی کرتے ہیں، دنیا کے بیسیوں کام کرتے ہیں اور پھر اللہ کی عبادت بھی نہیں چھوڑتے۔"

مسجد سے مولانا کو خاص انس تھا، زیادہ وقت مسجد ہی میں گذارتے تھے اور جب باہر رہتے تو بھی دل یہیں اٹکا رہتا، نمازوں کے لئے مسجد میں اذان سے بہت پہلے پہنچ جاتے قبل نماز فجر سے اشراق تک اور پھر ظہر سے ختم مغرب تک اور پھر عشاء سے بارہ بجے رات تک مسجد ہی میں رہتے تھے۔ بارہ بجے کے بعد گھر پہنچ کر استراحت فرماتے مگر ٹھیک دو بجے شب کے پھر تہجد کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے اور نماز و ذکر و شغل میں طلوع صبح کا وقت قریب آجاتا، پھر تھوڑی سی دیر کے لئے لیٹ کر فجر کی اذان سے پہلے مسجد پہنچ جاتے ــــ مدت تک نماز جمعہ کے لئے مکہ مسجد (جو حیدر آباد کی سب سے عظیم الشان جامع مسجد تھی) اور عیدین کے لئے شہر سے باہر عید گاہ پیادہ پا آتے جاتے تھے، پھر تقاضائے عمر اور ایک معتقد کے اصرار پر واپسی موٹر کار پر ہونے لگی۔

جہاں تک اذکار و اشغال کا تعلق ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس عالم کے ہر گوشہ کی سیر کئے ہوئے تھے، نفی اثبات کے ذکر کا ایک خاص طریقہ ہے، جس میں دوران ذکر ذاکر کا عضو عضو الگ الگ ہو جاتا ہے، اس کو اصطلاح میں "ذکر ارّہ" اور "شغل اسد" بھی کہتے ہیں، ابتدائی دور میں مولانا نے یہ بھی کیا مگر پھر ترک فرما دیا اور کبھی کسی کو اسکی تلقین نہیں فرمائی۔

زہد و استغناء | قصبات اور دیہاتوں میں زاہدانہ زندگی پھر سہل ہے، مگر شہر کے معدودہ میں اور وہ بھی حیدر آباد جیسے پُر تکلف متمدن شہر میں رہ کر زہد کامل کی جیسی مثال مولانا نے قائم فرما دی وہ انہیں کا حصہ تھا ــــ ان کی علمی عظمت اور ان کے درس کی شہرت کی وجہ سے افتاء کا سرکاری عہدہ اور مدرسہ نظامیہ کی مدرسی کی پیشکش ہوتی رہی، مگر مولانا انکار ہی فرماتے رہے، والد بزرگوار (رحمۃ اللہ علیہ) اسوقت حیات تھے، انہوں نے ان لوگوں سے کہا کہ میرا لڑکا فقیر ہے وہ کوئی منصب قبول نہ کریگا۔ اگر آپ لوگوں سے ہو سکے تو کچھ وظیفہ سرکار سے مقرر کرانے کی کوشش کریں ورنہ اس قصہ کو چھوڑ دیں۔ چنانچہ بعض اہل رسوخ نے اپنی طرف سے حضور نظام کی خدمت میں معروضہ پیش کیا، خدا کی قدرت کہ اعلیٰحضرت میر عثمان علی خان مرحوم نے حکم صادر فرمایا کہ ۲۰ روپیہ وظیفہ دعاگوئی جاری کر دیا جائے، چنانچہ بس اسی پر گذارا رہا، حالانکہ مولانا کثیر العیال بھی تھے۔

مولانا کا ایک موروثی مکان تھا جسکا ایک حصہ پختہ بنا ہوا تھا اور دوسرا محض سفالی تھا، والد ماجد کے انتقال پر مولانا نے پختہ حصہ اپنے چھوٹے بھائی کو دیا اور خود سفال پوش اور مٹی کے فرش والے حصہ میں رہے اور اس میں بھی خود مولانا کے کمرہ کا نقشہ یہ تھا کہ ایک بڑی سی چٹائی جس پر ایک کمل بچھی ہوئی، سرہانے کو کتب حدیث کا انبار، کمرہ کے ایک گوشہ میں صراحی گلاس اور اہلیہ محترمہ کا پاندان، دوسرے میں ایک معمولی سا ٹرنک، بس یہی کل اثاث البیت تھا۔

مولانا نے نذرانوں کا دروازہ بھی بند کر رکھا تھا، اس سلسلہ میں ایک چشم دید واقعہ اب تک تصور کے پردہ پر تازہ اور نہایت متاثر کن ہے۔ میں عصر و مغرب کے درمیان درس گلستان کیلئے حاضر خدمت تھا، مولوی میر یوسف علی صاحب (یوسف یار جنگ مرحوم) حضرت کے بڑے معتقد اور غالباً شاگرد بھی تھے، حاضر خدمت ہوئے اور دو غالیچے جو مصلے سے ذرا بڑے ہوں گے، حضرت کی خدمت میں بطور نذر پیش کئے۔ حضرت نے ان کو چھوئے بغیر فرمایا کہ "میں ایک بوریا نشین، اسکو لے کر کیا کروں گا، آپ واپس لے جائیں" مگر جب انہوں نے عاجزانہ اصرار پر اصرار کیا تو حضرت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی جگہ سے ہٹ کر فرمایا کہ بچھا دیجئے، انہوں نے بچھا دیا تو اس پر ایک قدم رکھ کر دوسری طرف اس طرح نکل گئے جیسے کوئی انگارے پر پاؤں رکھ کر گذر جاتے، اور فرمایا میں نے آپ کی بات مان لی، آپ اب میری بات مان لیں اور اسکو اٹھالیں، چنانچہ یوسف یار جنگ مرحوم نے خود لپیٹ کر ان قالین کے ٹکڑوں کو اٹھالیا۔ (باقی آئندہ)

جناب مولانا عبداللہ شاہ صاحب نقشبندی کراچی
خلیفہ مجاز حضرت مولانا مرحوم

حضرت مولانا عبدالغفور مدنیؒ کا سفرِ آخرت

حضرت شیخ مولانا عبدالغفور صاحب عباسی نور اللہ مرقدہٗ کے حالات کے متعلق خیال کیا کہ مرض موت اور وفات پر کچھ عرض کروں۔

محترما! حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مدینہ اطہر سے دو گرامی نامے ایک بنام حقیر اور دوسرا بنام حاجی محمد حبیب صاحب پاکولا والے آگئے، دونوں میں یہ مضمون تحریر تھا کہ ضعف بڑھ گیا ہے۔ حرم شریف کی حاضری پنجوقتہ نہیں ہوسکتی ہے، کبھی کبھی ٹیکسی میں جاتا ہوں۔ آپ حضرات کے لیے خصوصاً اور عامۃ المسلمین کے لیے دعائیں مانگتا ہوں۔ اللہ پاک قبول فرمادیں۔

یہ مضمون پڑھ کر قلب کو کافی صدمہ پہنچا، اور دونوں نے طے کیا کہ جیسا بھی ہو علاج کیلئے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کو کراچی بلانا ضروری ہے۔ چنانچہ عریضہ بھیجدیا گیا۔ جواب ملا کہ مدینہ منورہ کی جدائی برداشت نہیں ہوسکتی ہے۔ ثانیاً لکھا گیا کہ علاج مسنون ہے۔ آپ کا اس حالت میں مدینہ منورہ میں ہوتے ہوئے بھی حرم شریف کی غیر حاضری ہوتی ہے۔ تو تھوڑے دنوں کیلئے فراقِ مدینہ اختیار فرمادیں تاکہ علاج سے اللہ پاک آپ کو صحت اور قوت عنایت فرمادے۔ اور مقصد ہجرت جو کہ حرم شریف کی جماعت اور روضۂ اطہر پر صلوٰۃ و سلام ہے، حاصل ہوتا رہے۔ ساتھ ساتھ ڈاکٹر صدیق صاحب جو کہ کراچی میں نمبر ایک سرجن ہیں، ان کا بھی خط گیا کہ آپ صرف آٹھ دن کے لئے تشریف لے آئیں، انشاء اللہ آٹھ دن بعد آپکو واپس بھیجدیں گے۔

چنانچہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ۲۳ اپریل ۱۹۶۹ء بدھ کے دن بوقت عصر کراچی پہنچ گئے۔

اور ۲۵ یوم الجمعہ ہسپتال میں داخل ہو گئے، اور اسی دن ایکسرے لیا گیا۔ ڈاکٹر صدیقی نے علاج سے معذرت کی کہ معاملہ آگے بڑھ گیا ہے۔ مرض معدے کا کنسر ہے، اور منہ معدہ تقریباً بند ہو چکا ہے۔ معاملے کو حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے راز میں رکھا گیا۔ اور خون کی بوتل اور طاقت کے انجکشن شروع کئے۔ اور مزید تسکین قلب کے لئے ڈاکٹر امان اللہ صاحب سول ہسپتال اور ڈاکٹر کرنل سعید صاحب جناح ہسپتال کو بلایا، انہوں نے ڈاکٹر صدیقی صاحب کی رائے سے اتفاق کیا۔

دریں اثنا حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فقیر سے دریافت فرمایا کہ شاہ صاحب میرا مرض کنسر تو نہیں ہے، فقیر نے عرض کیا کہ حضرت اللہ پاک آپکو اس موذی مرض سے محفوظ رکھے، پھر فرمایا کہ ڈاکٹر لوگ میرا باقاعدہ علاج کیوں شروع نہیں کرتے ہیں۔ فقیر نے عرض کیا کہ باقاعدہ علاج آپکا اپریشن ہے۔ اور کمزوری زیادہ ہے اپریشن اس وقت مناسب نہیں ہے۔ اس لئے ان کا خیال ہے کہ حضرت کو طاقت کی دوائی دیں گے اور بہتر ہے کہ مدینہ منورہ جاکر اسکو استعمال فرمایا کریں جب طاقت آجائے پھر کراچی تشریف لے آویں، بآسانی علاج ہو جائے گا، مدینہ جانے کا سننا تھا کہ حضرت خوش ہو گئے اور فرمایا: پھر جلد جانا چاہئے۔ چنانچہ بدھ کے دن ۳۰ اپریل کو صبح ۹ بجے یہاں سے روانگی ہوئی، ان کے صاحبزادہ عبدالرحمٰن صاحب تو مدینہ منورہ سے ساتھ آئے تھے، ہم پانچ نفر یہاں سے ساتھ ہو گئے۔ ظہر جدہ میں پڑھی عصر بدر شریف اور مغرب بیر علی سے ایک منزل قبل، عشاء ایک بجے مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ بار بار شکر کرتے رہے کہ مدینہ طیبہ پہنچ گیا۔

یہاں کا تجویز شدہ علاج جاری رکھا اور خون کی بوتل وہاں بھی چڑھاتے رہے۔ ایک ڈاکٹر ایک کمپوڈر وہاں اکثر حاضر رہتے تھے۔ اہل مدینہ جوق در جوق تیمارداری کے لئے آتے تھے، اور حضرت والا باوجود اتنی کمزوری کے ہر سلام کا جواب اور کیف الحال یا شیخ کا جواب الحمدللہ طیب فرماتے تھے۔ کچھ دن تو وضو کیلئے غسلخانہ تشریف لے جاتے رہے۔ اور نماز باجماعت قیام کے ساتھ ادا فرماتے رہے۔ پھر کمزوری بڑھ گئی، تیمم کرکے پلنگ سے اتر کر بیٹھ کر باجماعت نماز ادا فرماتے رہے۔ اور دست راست کی انگلیاں صورت اشارہ بالسبابہ اختیار کر گئیں جو کہ موت تک اسی حالت میں رہیں، شب جمعہ مرض نے شدت اختیار کیا۔ پیٹ پر ہاتھ پھیرتے تھے اور کہتے تھے "یا اللہ رحم دکھ" اس کے علاوہ کوئی لفظ میں نے نہیں سنا تھا۔ آدھی رات کے قریب رفقاء کی جماعت آرام کرتی تھی۔ فقیر نے چارپائی کے ساتھ کرسی بچھا دی تھی، اسی پر بیٹھا ہوا تھا، اچانک حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے دست راست سے اشارہ کیا، اور فرمایا آجاؤ، پھر فرمایا آجاؤ، پھر

دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا اور فرمایا "یا سید آجاؤ" فقیر تماشائی بنا بیٹھا تھا، اتنے میں علاؤالدین شاہ صاحب اٹھ کر پاس آ گئے، فقیر نے اسکو اشارہ سے سمجھایا کہ بیٹھ جاؤ۔ وہ بیٹھ گیا۔ فقیر نے اس کی یہ تعبیر کی کہ ارواح مقدسہ زیارت کے لئے آئے ہیں۔ انکو اجازت دی جاتی ہے۔ واللہ اعلم،

صبح نماز باجماعت اشارے کیساتھ پلنگ پر پڑھی، ناشتے کے وقت دریافت فرمایا کہ ربیع الاوّل کا چاند دیکھا گیا ہے یا نہیں۔ فقیر نے جواب دیا: حضرت بموجب ڈائری آج ۳۰ صفر ہے۔ رات کو چاند نظر آجائے گا۔ اس کے بعد مکمل سکوت اختیار کیا، اور تمام لطائف حرکت میں آگئے، یہاں تک کہ پورا جسم ہلتا تھا۔ اور قلب مبارک سینہ کو ضربیں دیتا تھا۔ اور زبان سے اللہ اللہ کا ورد شروع ہوا جو کہ بہت دھیمی آواز میں تھا کان لگا کر سن سکتے تھے۔ یوم جمعہ شب ہفتہ یوم ہفتہ اسی حال میں گذر گئے۔ شب اتوار کو بڑا ڈاکٹر ۳ بجے آگیا، دیکھ کر کہا کہ ٹھیک ہے۔ وہ بیٹھ گیا۔ فقیر حضرت والا رح کے پلنگ پر پاؤں کیطرف بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت والا نے ایک نظر فقیر کی طرف دیکھا۔ یکایک اللہ پاک نے دل میں القاء کیا کہ شاید یہ نظر اخیری ہو، جماعت کو کہا کہ اگر آپ حضرات اجازت دیتے ہیں تو یہ عاجز تبرکاً سورۃ یٰسین پڑھے۔ سب نے ہاں کہا۔ فقیر سینے کے پاس کھڑا ہو گیا، ڈاکٹر بھی اٹھ کر آیا۔ اور جماعت بھی اٹھ کر چارپائی کے پاس آگئی۔ جب فقیر نے والیہ ترجعون پڑھا تو حضرت والا رح نے پھر ایک نظر ڈال کر آنکھیں بند کیں۔ فقیر نے حشمت علی صاحب کو کہا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی روح نے پرواز کیا۔ آپ آنکھوں پر انگلی رکھ دیجئے کہ کھلی نہ رہ جائیں۔ انہوں نے تعجب کیا اور ڈاکٹر صاحب کو کہا کہ ڈاکٹر صاحب دیکھ لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے استھیٹسکوپ دل پر رکھا اور کہا کہ شاہ صاحب حضرت زندہ ہیں، قلب حرکت کرتا ہے۔ فقیر نے جواب دیا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے استھیٹسکوپ کو سنبھالئے یہ دل مرے گا نہیں۔ اس نے تو بارِ اللہ ہزاروں دلوں کو زندہ کیا ہے۔ پھر انہوں نے گلے میں شہ رگ پر رکھا: کہا ہاں روح نکل گئی ہے۔ یہ تھا حضرت رح کا سفرِ آخرت۔ ڈاکٹر جیسے تجربہ کار کو بھی آثارِ موت کا پتہ نہیں چل سکا۔ اس وقت گھڑی دیکھی تو سعودی عرب کے ۲ بجکر ۲۰ منٹ تھے۔ فقیر نے پلنگ کیساتھ کرسی پر بیٹھ کر سورۃ بقرہ پوری پڑھ لی۔ آٹھ بج گئے اور تہجد کی آذان کا وقت تھا، حضرت کو غسل کیلئے ڈالا دیا گیا، حشمت علی صاحب غسل دیتے رہے، علاؤالدین شاہ صاحب پانی ڈالتے رہے اور مہدی خان صاحب پانی دیتے رہے۔ محمد صدیق صاحب اور ایک دوسرا عالم اس میں تعاون کرتے رہے۔ اور فقیر نے سر مبارک کو دونوں ہتھیلیوں میں پکڑ رکھا تھا کہ تختہ پر نہ لگے غسل کے بعد فقیر نے اپنے سر پر عمامہ باندھ کر حضرت رح کے سر مبارک پر رکھ دیا۔ جو

انوار اس وقت دیکھنے میں آئے اس کا کیا بیان ہو سکے گا۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

اس کے بعد جبین انور کو بوسہ دیکر کفن میں ملفوف کیا، اور چالیس قدم گن کر جنازہ لوگوں کے حوالہ کیا۔ جب باب الرحمت کے اندر جنازہ داخل ہوا، تو ادھر سے آذان فجر شروع ہوئی۔۔۔۔ روضۃ الجنت کے آگے جنازہ رکھا گیا۔ امام حرم شریف نے سلام پھیرا ہم نے فوراً جنازہ سامنے رکھا مکبر نے مکبر الصوت پر اعلان کیا: الصلوٰۃ علی المیت الحاضر یرحمکم اللہ، ہزاروں کی تعداد میں جو نمازی حاضر تھے، نماز جنازہ میں شریک ہو گئے۔ اور جنت البقیع میں جوار ذی النورین جو کہ افضل البقعہ فی البقیع ہے، مدفون ہو گئے۔ اللھم اجعل قبرہ روضۃ من ریاض الجنۃ۔ آمین یا رب العالمین۔ جنازہ میں باہر سے تشریف لائے ہوئے مشاہیر میں سے حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سہارنپوری اور مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب نے بھی شمولیت کی۔ حضرت شیخ الحدیث باوجود ضعف و نقاہت کے اپنی گاڑی میں بقیع تک گئے اور کافی دیر تک اکیلے قبر مبارک پر ٹھہرے رہے۔ ■

خلقکم فمنکم کافر و منکم مومن وہ ہو علی کل شئ قدیر ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ملک کی ایک تحریک کے قائد نے مغربی اقوام کے اکتشافات و ایجادات کو دیکھ کر دنیا کی وراثت کا حقدار انہی ملحدین کو قرار دیا تھا۔ اور قرآن میں تحریف کرکے ان الارض یرثھا عبادی الصالحون کو انگریز پر منطبق کر دیا۔ انا للہ۔۔۔۔۔۔

آج پھر ایک دفعہ وہ لوگ اور انکار سنت کی بدترین گروہ قوم کے ذہن کو چاند کے تسخیر کرنے پر دین حنیف سے منحرف کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ اور روس و امریکہ کے اس قسم کے کارناموں کو مافوق الفطرت کمالات ثابت کرنے میں پیش پیش ہیں۔ ہمارے ساتھ جب اس قسم کی بحث کی جاتی ہے تو ہم اجمالاً وسعت کائنات کے متعلق جواب دیکر "آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا" سے انکو ٹالدیتے ہیں۔ لیکن اس دفعہ وسعت کائنات پر الحق کے اداریہ میں آپ نے جو سعی بلیغ فرمائی ہے اسکو اپنی دل کی آواز جانکر بے ساختہ آپکے حق میں علم و عمل کی دعا نکلتی ہے۔

ماہ جولائی میں الحق کا اداریہ وقت کا تقاضا و آواز ہے اور اہل زیغ کیلئے تسلی بخش جواب ہے متردین کیلئے تشفی ہے۔ اس بناء پر گزارش ہے کہ آپ اس اداریہ کو پمفلٹ کی شکل میں شائع فرماکر کالجوں، دفاتر اور دانشوروں میں مفت تقسیم کریں۔ یہ ایک کام ہے، جو اللہ تعالیٰ نے آپکے ہاتھ سے لیا ہے۔ اب اسکو وسیع کرنے کیلئے جلد از جلد پمفلٹ کی شکل میں شائع کرنا چاہئے۔

(سعید الدین)

ایسے امور مشوروں سے زیادہ قارئین کے تعاون اور عملی اقدام کے منت پذیر ہوا کرتے ہیں۔
(ادارہ الحق)

احوال و کوائف

مولانا سلطان محمود ناظم دفتر اہتمام

حضرت شیخ الاسلام قطب العصر مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کے خلف الصدق مخدوم زادہ محترم حضرت مولانا سید محمد اسعد مدنی جنرل سیکرٹری جمعیۃ العلماء ہند سفر افریقہ مشرق وسطیٰ سے واپسی پر بہت ہی مختصر عرصہ کیلئے اپنے بعض اکابر و اساتذہ بالخصوص بقیۃ السلف مولانا عزیر گل صاحب مدظلہ اسیر مالٹا کی زیارت کیلئے طیارے کے ذریعہ پاکستان ٹھہرے۔ ۱۵ جولائی کو آپ کویت سے کراچی پہنچے متعلقہ حکام نے مہربانی فرما کر سخاکوٹ اور اکوڑہ خٹک کا ویزا عنایت فرمایا چنانچہ ۱۶ جولائی کو بذریعہ طیارہ شام ساڑھے سات بجے آپ پشاور کے ہوائی اڈہ پر پہنچے۔ جہاں کسی کو اطلاع نہ دی جا سکنے کے باوجود ممتاز اور مشاہیر علماء کرام استقبال کیلئے پہنچ چکے تھے حضرت مولانا عزیر گل صاحب مدظلہ کے گاؤں سخاکوٹ راتوں رات جانا مناسب نہ سمجھا گیا اس لئے رات مولانا محمد یوسف بیان نوری کی قیامگاہ ہائی ماڑی میں قیام فرمایا۔ صبح ۱۷ جولائی کو حضرت مولانا مدظلہ کی قیامگاہ واقع میا نکلانیکلہ سخاکوٹ تشریف لے گئے۔ دوپہر وہاں قیام فرمایا۔ نماز ظہر کے بعد علماء احباب اور حضرت شیخ کے متوسلین کی معیت میں دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک تشریف لائے جہاں سینکڑوں علماء طلبا اور مشتاقین دیدہ چشم براہ تھے۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے آپ کو مختصراً دار العلوم کے بعض شعبوں کا معائنہ کرایا۔ نماز عصر آپ نے دار العلوم کی جامع مسجد میں ادا کی اور اس کے بعد بغرض واپسی پشاور روانگی ہوئی جہاں سے بعد از نماز مغرب آپ کو متوسلین شیخ نے باچشم پرنم الوداع کہا۔ حضرت مولانا کا یہ دورہ بالکل ہی اچانک اور بہت ہی مختصر تھا۔ مولانا مدظلہ کی طرف سے بھی ہر قسم کے استقبالی جلسہ وغیرہ پر سخت پابندی تھی اس لئے بیشمار مشتاقین دید زیارت سے مستفید نہ ہو سکے۔ ہماری دعا ہے کہ آئندہ کبھی حضرت مولانا مدظلہ لمبا پروگرام بنا کر تشریف لا سکیں۔ دار العلوم حقانیہ کے بارہ میں حضرت مولانا نے کتاب الآراء میں نہایت عجلت سے حسب ذیل تاثرات ثبت فرمائے :-

"آج یکم جمادی الاول مبارک ۱۳۸۶ھ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک استاذی المحترم حضرت مولانا عبد الحق صاحب مدظلہم کی دعوت پر آیا۔ مجھے خوشی ہوئی دار العلوم سے ہمارے حضرت مدنی قدس سرہٗ کا خاص تعلق تھا یہ تمام مدنی حضرات جو دار العلوم کے دار الحدیث میں میرے چاروں طرف بیٹھے ہیں یہ ہمارے حضرت قدس سرہٗ کی یادگار ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس دار العلوم کو قائم دائم رکھے اور اس کے تمام متعلقین اور معاونین اور خصوصی طور پر حضرت مولانا عبد الحق صاحب مدظلہ کو سلامت رکھے۔ آمین۔"

اسعد غفرلہٗ - ۱۷ جولائی ۱۹۶۶ء

ایڈیٹر کے نام خطوط

افکار و تاثرات

- ایک شرمناک مظاہرہ
- تسخیر قمر اور تفتیش آغاز

کالج میں ہپی ازم کا پرچار آج اس خط میں ہوم اکنامکس کالج پشاور یونیورسٹی کے بارہ میں ایک شرمناک اور پاکستان کے تمام علمی اداروں کیلئے ایک چیلنج دینے والی خبر لکھ رہی ہوں جسکی راوی پشاور یونیورسٹی کی اسلامیات میں ایم اے کرنے والی میری خالہ زاد بہن ہے۔ اگر آپ نے اسے شائع نہ کیا تو قیامت کے دن میرا آپ سے اسلامی شکوہ ہوگا۔ اس خبر سے لوگوں کو پتہ چل جائیگا کہ ہمارے تعلیمی ادارے کس حد تک اخلاقی دیوالیہ پن کا ثبوت دے رہے ہیں۔

۶ ماہ جون — اس کالج کے پروفیسروں نے لڑکیوں کو حکم دیا کہ ہپی کا مقابلہ ہوگا، جو لڑکی حرکات اور لباس میں بہترین ہپی کا پارٹ ادا کرے گی اسے اول انعام دیا جائیگا — چنانچہ ...... بیگم کی روایت کے مطابق بے حیائی کا یہ مقابلہ مقررہ وقت پر ہوگیا۔ اس مقابلے میں جو ابتدائی سین دیکھنے میں آیا وہ نہایت شرمناک اور رسوا کن تھا۔ اور مارے شرم و غصہ کے حیادار لڑکیوں کا خون کھولنے لگا۔ مقابلہ میں شامل لڑکیاں ہپیز لڑکیوں کیطرح ایسی حرکات کر رہی تھیں جو ناقابل بیان ہیں۔ اور پھر مقابلہ ختم ہوا اور زاہدہ سیٹھی نامی ایک طالبہ کو اس مقابلہ میں فرسٹ پرائز ملا۔ میں یونیورسٹی کے وی۔ سی صاحب کو بھی اس بارہ میں خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے کہ اسلامی حمیت کی بناء پر آپ اس خبر کو نظر انداز نہ کریں گے۔ (ایک صالح خاتون۔ پشاور صدر)

> اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس ملک کے دین، ثقافت اور قومی روایات کیلئے ایک نہایت شرمناک چیلنج ہے۔ ہمیں امید ہے کہ متعلقہ حضرات اسکی تحقیق محاسبہ اور آئندہ کیلئے ایسے امور کا سختی سے سدباب کرنے کیلئے فوری قدم اٹھائیں گے۔ (ادارہ الحق)

چاند کی تسخیر چاند کو مسخر کرنے کی جو دوڑ اسوقت دو حکومتوں میں شروع ہے۔ اسکو دیکھ کر دین کے فہم سے قاصر لوگ نہ صرف انگشت بدنداں ہیں۔ بلکہ یہ چیز ان کے عقیدہ پر بھی کافی حد تک اثر انداز نظر آرہی ہے۔ یہ ایک تقسیم ازلی ہے کہ دنیا میں ہمیشہ دو ہی قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ھوالذی

باقی ص ۶۲ پر